عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی !!

اِدارۂ اشرفیہ عزیزیہ کا ترجمان

ماہنامہ غزالی

جمادی الآخر ۱۴۳۵ھ / اپریل ۲۰۱۴ء

زیر سرپرستی : مولانا پروفیسر ڈاکٹر سید سعید اللہ دامت برکاتہم

بانی : ڈاکٹر فدا محمد مدظلہٗ (خلیفہ مولانا محمد اشرف خان سلیمانیؒ)

مجلس مشاورت : حاجی شیر حسن صاحب، مفتی آفتاب عالم، مولانا محمد امین دوست
مولانا محمد طفیل، قاضی فضل واحد، مولانا طارق علی شاہ بخاری

مدیر مسئول : ثاقب علی خان

مجلسِ ادارت : ڈاکٹر محمد طارق، محمد الطاف حسین، حافظ عماد الحق، ظہور الٰہی فاروقی

Reg No. P476

جلد: دوازدھم

شمارہ: 8

فہرست

عنوان	صاحبِ مضمون	صفحہ نمبر

فی شمارہ : 15/- روپے

سالانہ بدل اشتراک : 200/- روپے

ملنے کا پتہ : پوسٹ آفس بکس نمبر 1015، یونیورسٹی کیمپس، پشاور۔

ای-میل : physiologist72@hotmail.com

saqipak99@gmail.com

ویب سائٹ : www.darwaish.org.pk

تمام گزشتہ شمارے ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

سکندر اور قلندر اور حکومتِ پاکستان

(حضرت ڈاکٹر حاجی فدا محمد صاحب دامت برکاتہٗ)

سکندر خوش نہیں ہے لوٹ کر دولت زمانے کی

قلندر دونوں ہاتھوں سے لُٹا کر رقص کرتا ہے

سکندر اعظم یونان کی ریاست مقدونیہ کا حاکم ساری دنیا کو فتح کرنے کے منصوبے کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔ قلندر کی اصطلاح تصوّف میں عرصے سے استعمال ہو رہی ہے جو ایسے ولی کے بارے میں بولی جاتی ہے جس کا خدا تعالیٰ پر ایسا کامل توکّل ہو کہ سب کچھ لُٹا کر بھی پریشان نہ ہو بلکہ خوشیاں منائے۔ پاکستان کی تاریخ میں بھی ایک سکندر گزرا ہے۔ یہ سکندر مرزا پاکستان کا صدر تھا۔ نسلاً مشہور غدّار میر صادق کی اولاد سے تھا۔ میر صادق وہ شخص ہے جس کی غدّاری سے ٹیپو سلطان کی شہادت ہوئی اور میسور کی اسلامی ریاست کا خاتمہ ہوا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کی نسل میں سے سکندر مرزا پورے پاکستان کا صدر بن بیٹھا۔ مکمل مغربی ذہن، دین سے بے زار اس شخص نے ایک دفعہ کہا: ''میرا دل چاہتا ہے کہ پاکستان کے علماء کو سونے کی کشتی میں بٹھا کر بحرِ ہند میں غرق کر دوں۔ اس سے پاکستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

اس سکندر کے مقابلے میں اس زمانے میں ایک قلندر بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ قلندر مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہوتے تھے جو ایسے سکندر پر آسمانی بجلی بن کر ٹوٹتے تھے۔ انھوں نے فوراً سکندر مرزا کے بیان کے ردِ عمل میں کہا: ''انشاء اللہ اس کو چاندی کی کشتی میں بٹھا کر ملک سے نکالیں گے۔'' چنانچہ مجھے یاد ہے 'قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید' قلندر جو کہتا ہے گویا دیکھ کر کہتا ہے کہ ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر دو ہاتھ دو پیر سکندر مرزا کو بیوی کے ہمراہ ملک بدر کیا۔ اس زمانے میں نسیم حجازی کا 'کوہستان' اخبار شائع ہوا کرتا تھا۔ ملک سے نکلتے ہوئے پیچھے سے سکندر مرزا اور اس کی بیوی ناہید کی تصویر لی گئی تھی جو کوہستان اخبار نے شائع کی۔

مدارس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے والے حکام کو ان واقعات سے عبرت لینی چاہئے۔

اطلاع

انشاء اللہ آئندہ ماہانہ اجتماع بروز ہفتہ ۲۶ اپریل ۲۰۱۴ء کو خانقاہ میں منعقد ہوگا۔

بیان مغرب کی نماز کے بعد ہوگا۔

تعمیرِ نو میں ملت کا کردار

(حضرت مولانا مولانا محمد اشرف خان صاحب سلیمانیؒ)

اسلام کے نام پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ لاکھوں افراد نے اپنے جان ومال کی قربانی صرف اس لئے دی کہ ایک خطۂ زمین حاصل کر کے اِس میں خدا کا قانون نافذ کیا جائے۔ مگر آج بہت سے سر پھرے کہہ دیتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے لیے نہیں بنا تھا۔ ریاست اور حکومت کا نظام وضع کرنے کے لیے اسلام کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے ملک کی تعمیر نو بغیر ملت و شریعتِ محمد یہ کے ناممکن ہے۔ اس مضمون میں اِسی پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ جس کی بنیاد اسلام کے اس جامع اور عالمگیر نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ دینِ اسلام ہی انسانوں کے دینی ودنیاوی تمام مسائل کے حل اور ضرورتوں کا کفیل ہے۔ بانیانِ پاکستان قائداعظم مرحوم، لیاقت علی خان مرحوم اور دیگر زعمائے مسلم لیگ پاکستان کی جدوجہد میں اسی نظریہ کو لے کر آگے بڑھے تھے اور اسی کی بنیاد پر اسلامیانِ ہند و پاک نے اپنی امنگیں اور امیدیں اس خطۂ زمین کے ساتھ وابستہ کر دی تھیں، جس کا نام پاکستان تھا اور جس میں بقول شہید ملّت لیاقت علی خان مرحوم اسلامی نظریۂ حیات کو عملی طور پر رائج کرنا اور اسے اسلامی نظامِ حیات کی تجربہ گاہ بنانا تھا۔ قائداعظم نے اپنے کئی بیانوں میں اس بات کو واضح فرما دیا تھا کہ قرآن ہی مسلمانوں کا واحد ضابطۂ حیات ہے، جس میں اس کی آئینی، قانونی، مجلسی، معاشی، معاشرتی، غرض زندگی کے ہر ایک پہلو کا کامیاب حل موجود ہے۔ یاددہانی کے طور پر چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

قائداعظم نے نومبر ۱۹۳۹ء عید الفطر کے موقع پر بمبئی سے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ قرآن پاک کو غور سے پڑھیں اور قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کر سکتی۔“

گاندھی کو اگست ۱۹۴۴ء میں لکھتے ہیں:

”قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اور فوجداری، عسکری اور معاشرتی غرض کہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ امورِ حیات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لیکر انسدادِ جرائم تک، زندگی میں جزا اور سزا سے لیکر عقبیٰ کی جزا اور سزا تک ہر فعل، قول اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہے تو

حیات و مابعدِ حیات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں۔''

ستمبر ۱۹۴۵ء کے پیغام عید میں فرمایا۔

''ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات اور اخلاقیات تک ہی محدود نہیں بلکہ قرآن کریم سب مسلمانوں کا دین و ایمان اور قانونِ حیات ہے۔ یعنی مذہبی، معاشرتی، تمدنی، تجارتی، عسکری، عدالتی اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔''

۱۹۴۴ء میں علی گڑھ میں ایک تقریر میں فرمایا:

''رہنمائی کے لئے ہمارے پاس اسلام کی عظیم الشان شریعت موجود ہے۔ اسلام ہر شخص سے امید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض بجالائے۔''

آل انڈیا مسلم اسوڈنٹس فیڈریشن جالندھر ۱۹۴۳ء کی صدارتی تقریر میں واضح الفاظ میں اعلان فرمایا:

''مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت کیا ہوگا۔ پاکستان کا طرزِ حکومت تعین کرنے والا میں کون؟ یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے اور میرے خیال میں مسلمانوں کے طرزِ حکومت کا آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا ہے۔''

تقسیم سے پیشتر شہیدِ ملّت لیاقت علی خان مرحوم نے جلسہ تقسیم اسناد علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمارے سامنے ایک نہایت اہم سوال درپیش ہے اور وہ یہ کہ تم کس نظام کے تحت زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنی آئندہ زندگی اسلامی طور طریق اور آئین وقوانین کے بموجب بسر کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہم کو ایک آزاد اور خودمختار سلطنت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نظام زندگی کیا ہے اور کن اصولوں پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جائے گی۔ اس سوال کا جواب مسلمان کے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمان کے پیش نظر اس مقصد حیات کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تیرہ سو برس قبل دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغام الٰہی لے کر تشریف لائے تھے۔ اب وہ ہمارے پاس ہے اور وہ دنیا کی عظیم المرتبت کتاب قرآن شریف میں اب بھی بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے موجود ہے۔ ہر مسلمان کا دین وایمان ہے کہ اس کی موت وحیات سب اللہ ہی کے لئے وقف ہے۔ اللہ ہی ہمارا بادشاہ ہے اور وہی ہمارا حکمران ہے۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ جو کوئی بھی حکومت کرتا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے حکومت کرتا ہے کیونکہ تمام حاکمیت اور طاقت اللہ ہی کو زیبا ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی انسان کا ساختہ پرداختہ نہیں بلکہ واقعی طور پر وہ اس دنیا

میں عمل پذیر رہ چکا ہے اور اب بھی ہمارے پاس موجود ہے۔''

ان زعمائے ملّت کے یہ واضح اعلانات حقیقتاً اس سچائی پر مبنی تھے کہ امتِ محمدیہ کا اپنا ایک خاص مزاج ہے اور یہ لافانی اور بے مثال امت ہے۔ اپنے قوام و تشکیلِ ملی میں صرف اس اندرونی یقین و اعتقاد و جذبۂ وحدت کی محتاج ہے جسے 'ایمان' کہتے ہیں۔ امتِ محمدیہ کا مزاج سراسر دین پر قائم ہے۔ اگر اس کے دینی مزاج کی رعایت نہیں کی جائے گی تو یہ ملّت مِن حیث الامت ختم ہو جائے گی۔ دوسری قومیں رنگ و نسل، وطن و زبان کی بنیادوں پر تشکیل پاتی ہیں لیکن اسلام ان میں سے کسی بنیاد کو اصل قرار نہیں دیتا۔ وہ ان سب کی تخریب کے بعد اس مابعد الطبیعیاتی جذبۂ ملّی پر 'امت' کی تشکیل کرتا ہے جسے 'دین' کہتے ہیں۔ اسلام وہ قومی رشتہ ہے جو مختلف قوموں، رنگوں اور نسلوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ صہیب رومیؓ ہوں یا بلال حبشیؓ، سلمان فارسیؓ ہوں یا ابوبکر قریشیؓ، سب ایک ہی ملّتِ واحدہ کے محترم افراد ہیں۔ ان کی 'اسلامیّت' نے رنگ و نسل کے تمام بندھنوں کو توڑ دیا۔ پولیٹیکل سائنٹسٹ موسیو رینان فرنساوی نے کہا ہے:

''قومیت وہ جذبۂ اشتراک ہے جو مختلف افراد کو ایک لڑی میں پرو کر انہیں مقاصدِ حیات کی یکجہتی عطا کرتا ہے۔''

اسلام مسلمانوں میں عشقِ الٰہی و محبت رسول کا والہانہ جذبہ پیدا کر کے اس داعیۂ اشتراک کو جنم دیتا ہے جو مختلف نسلوں اور مختلف رنگوں اور مختلف طبقات کے انسانوں کو اکھٹا کر دیتا ہے۔ یہ رشتۂ روحانی، نسلی رشتہ سے برتر و قوی تر ہے۔ چنانچہ امام رازیؒ و امام بغوی وغیرہ نے شواہد سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔

اسلامی جذبۂ ملی کے ایک سرشار سلمان فارسیؓ نے 'اسلامی قومیت' کی بنیاد کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

''میرے باپ کا نام اسلام ہے۔ اسلام کے سوا میرا کوئی باپ نہیں، لوگ قیس و تمیم کے قبیلوں پر فخر کرتے ہیں (اور میں 'مسلم' ہونے پر فخر کرتا ہوں)۔''

اسلام ملّتِ مسلمہ کا اجتماعی نفسِ ناطقہ (اندر کی آواز) ہے۔ اگر اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ ملّت کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہوگا تو یہ امّت پھلتی پھولتی رہے گی اور جس قدر یہ جذبہ کم ہوتا جائے گا، اس پر اضمحلال و زوال کے آثار طاری ہوتے جائیں گے۔ حکیم شاعر اکبرالہ آبادی نے خوب کہا ہے

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر اُمید کا تھا
جب صرصر عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

ترجمہ: جب سر میں ماننے کا جذبہ تھا تو امیدوں کا درخت ہرا بھرا تھا۔ جب گناہوں کی تیز ہوا چلنے لگی

تو اس درخت نے پھلنا چھوڑ دیا۔

غرض امّتِ محمدیہ اپنے اقوام و مزاج میں جملہ امم و مللِ انسانیہ سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ دین و مذہب کے بغیر اس کا ملّی تشخص قطعاً ختم ہو جاتا ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری
دامنِ دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیّت کہاں
اور جمعیّت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

بہر حال اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد مذہب یعنی اسلام کی اہمیت پاکستان کی تعمیر نو میں ظاہر و باہر ہو جاتی ہے۔ ہر وہ نظام زندگی یا طریقۂ کار جو اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق نہیں ہوگا، پاکستانی ملّت کو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکے گا۔ اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔

(۱) پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کا وجود اسلامی نظریۂ حیات کا مرہونِ منت ہے۔ جسے تحریکِ پاکستان کا ہر واقف کار جانتا ہے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کوئی نظریاتی مملکت اپنے بنیادی نظریہ کو نظر انداز کر کے اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتی۔ جیسے کوئی سوشلسٹ مملکت سوشلزم کے نظریہ کو پسِ پشت ڈال کر اپنی حقیقت گم کر دیتی ہے۔ اسی طرح مملکت پاکستان اگر اپنے آپ کو اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر پاتی تو وہ نہ صرف اپنے نظریاتی وجود کو کھو دے گی بلکہ اس کا اپنا وجود و تشخص اور 'نام' بھی (خدا ایسا نہ کرے) مٹ کر رہ جائے گا۔ وہ ممالک اور قومیں جو وطنیت، رنگ اور نسل پر قائم ہیں، وہ اگر کسی نظریہ کو قبول یا ترک کر دیں تو ان کی وطنی، لونی اور نسلی انفرادیت باقی رہ سکتی ہے۔ لیکن اگر پاکستان اسلامی نظریۂ حیات سے دست کش ہو جائے تو اس کے ہاتھ سے وہ رشتہ ہی نکل جائے گا جس نے باشندگانِ پاکستان کو 'پاکستانی' بنایا ہے اور بنگالی، بلوچی، پٹھان، سندھی، پنجابی اور مہاجر، سب کو ایک امّت کا فرد بنایا ہے۔ غرض پاکستانی قومیت و وطنیت بلکہ اس کا نام تک اسلامی نظریۂ حیات سے باقی و قائم ہے۔ اس لئے پاکستان کی تعمیر نو کا تصور بھی مذہب کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ ہر وہ قدم جو پاکستان میں اسلام کے خلاف اٹھے گا ملک کو مشکلات سے دوچار کر دے گا۔

(۲) دوسری وجہ ہر قوم کا خاص مزاج ہوتا ہے جس کی بنیاد وہ بنیادی عقائد و نظریات اور رسوم و رواج ہوتے

ہیں جس میں وہ قوم دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے۔ امتِ محمدیہ اپنے مزاج کے لحاظ سے بہر حال 'مذہبی' واقع ہوئی ہے۔ جو اسلام کے خلاف کسی چیز کو گوارا نہیں کر سکتی اور اس کا اجتماعی مزاج کسی ایسی چیز کو ہضم نہیں کر سکتا جو اسلام کے مخالف ہو۔

ملّتِ پاکستانیہ کا ملّی شعور دائمی طور پر کبھی ایسی بات کو قبول نہیں کر سکتا جو مذہب کے خلاف ہو۔ اس وجہ سے قوم کے مذہبی مزاج کو نظر انداز کر کے کوئی قدم ملّت کو تعمیر کی راہ پر نہیں ڈال سکتا۔

ان دو اہم بنیادوں کا ذکر کرنے کے بعد چند حقائق کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

اسلام نرا نظریہ ہی نہیں بلکہ بقول قائد اعظم 'ایک مکمل اور عملی ضابطہ حیات ہے۔' دوسرے مذاہب عملی زندگی میں آ کر شکست کھا سکتے ہیں لیکن اسلام کا آئین و قانون، نظامِ حیات و دستورِ مملکت چودہ سو سال تک عملی کسوٹی پر کسا جا چکا ہے۔ اس میں ہر زمانہ کے چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسلام کا خدائی و عادلانہ نظامِ حیات دکھی انسانیت کے لئے واحد پیام نجات ہے۔ پاکستان کے مسائل کا حل بھی صرف اسلام ہے۔ جس کے بغیر ہمارا ہر مسئلہ مزید الجھتا جائے گا۔ آج پاکستان کی 'وحدت کا راز' مختلف لسانی و علاقائی وحدتوں کو ایک 'ملّت' کی حیثیت سے مضبوط کرنے میں ہے۔ یہ بات واشگاف لفظوں میں کہی جا سکتی ہے کہ تعمیرِ نو میں اگر اسلام کے 'جذبۂ ملّی' کو زندہ و باقی رکھنے کی کوشش نہ کی گئی اور مذہبی وحدت و حمیّت کی آبیاری نہ کی گئی تو خدانخواستہ اس پھول کی مختلف پتّیاں بکھر کر رہ جائیں گی جس کا سب سے بڑا ثبوت سقوطِ مشرقی پاکستان کا دردناک سانحہ ہے۔ اگر ہم نے اپنے دینی مزاج اور مذہبی یکجہتی کو پروان چڑھایا ہوتا تو آج یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ پاکستان کے مختلف خطوں اور لسانی و ثقافتی وحدتوں کے جوڑنے کا واحد ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس نمایاں حقیقت کے بعد تعمیرِ نو میں مذہب کی اہمیت بلکہ سبقت و فوقیت اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں معاشی ناہمواریوں سے معاشرہ میں زلزلہ آیا ہوا ہے۔ اور معاشی بے چینی اور طبقاتی منافرت کا ایسا طوفان برپا ہے جس سے ملک کی چولیں تک ہل گئی ہیں۔ ہمیں یہ بات برملا کہنے میں کوئی باک نہیں کہ پاکستانی بلکہ انسانی معاشی مسائل کا حل صرف اسلام کی لافانی تعلیمات میں ہے۔ اسلام کا نظامِ معاش، سرمایہ داری کی قارونیت اور مزدوکیت، اشتراکیت و اشتمالیت (Capitalism, Socialism, Communism) کی طبقاتی چپقلش کو بیک وقت ختم کر دیتا ہے۔ اسلام نے معاشی ناہمواریوں کا علاج جس عدل و انصاف سے کیا ہے، انسانی خود ساختہ نظام اس کا پرِ کاہ (تنکا) بھی نہیں کر سکتے۔ اسلام ایک طرف نجی ملکیت اور انفرادی عملِ پیدائش کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ دوسری طرف تقسیمِ دولت کی ان راہوں کو وجود بخشتا ہے جن سے دولت چند

ہاتھوں میں سمٹ کر نہیں رہتی۔ بلکہ ہر شخص کی ضروریات اربعہ (مکان، خوراک، پوشاک اور تعلیم) کی کفالت کے ساتھ باہمی ہمدردی اور مواسات (بھائی چارہ) بھوک وافلاس کو معاشرہ سے ختم کر دیتا ہے۔ تفصیل کا یہ مقام نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ ناجائز پیداوار دولت کے ذرائع، سود، قمار، احتکار (hording)، حرام آمدنیوں کو، جن کی کوکھ سے منحوس سرمایہ داری نے جنم لیا ہے، اسلام نے کس طرح حرام قرار دیا ہے۔ اور آمدنی کے وہ ذرائع جو دولت کو چند افراد کے ہاتھ میں پہنچا دیتے ہیں انہیں کیسے ختم کیا ہے۔ جو دولت کسی کے پاس جمع ہے اسے معاشرہ میں منتقل کرنے کے لئے زکوٰۃ وعشر، خمس وصدقات، میراث کے لازمی احکام صادر فرمائے۔ مزید برآں خیرات، صلہ رحمی، غریبوں کی غمگساری و مدد وغیرہ کی مستقل خیراتی مدیں قائم کیں۔ امیروں کے مال میں ناداروں کا حصّہ شرعی حدود کے اندر مقرر کیا۔

ناداروں کے مفاد کو مالداروں کا دین قرار دیا۔ اور مالداروں کے حقوق کو پورا کرنا ناداروں کی دینی ذمہ داری قرار دی گئی۔ اسلامی معاشی نظریہ کی جان ہر طبقہ کی ضروریات کی کفالت کے ساتھ باہمی ہمدردی و مواسات، مواخاۃ (بھائی چارہ) ومحبت ہے۔ اسلامی معاشی نظریہ انسانوں میں طبقاتی تفریق ومنافرت نہیں پیدا کرتا بلکہ ہر طبقہ کو اپنے دائرہ عمل میں افزائش دولت کے اسباب مہیا کرنے کے ساتھ ان میں ایسی باہمی ہم آہنگی اور جوڑ پیدا کرتا ہے جہاں حسد ورقابت کے بجائے محبت وتعاون کی فضا قائم ہوتی ہے۔ اسلام میں گو مساوات مالی نہیں لیکن مساوات رتبی (Equality of Status) اور مساوات قانونی موجود ہے۔ مجلسی رتبہ میں مال و جائیداد کی اضافی قدروں کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اخلاق واعمال کی بلندی 'سرفرازی' کا واحد معیار ہے۔ اسلام میں ملک و مال، جائیداد و جاہ معیار فضیلت نہیں۔ بلکہ علم وتقویٰ اور اخلاق و اعمال معیار ہیں۔ ایک غیور و دیندار صاحب صلاح وتقویٰ مزدور ایک کروڑ پتی بداعمال سیٹھ سے اسلام کی نگاہ میں اونچا ہے۔ اسی طرح قانون کی نگاہ میں آقا وغلام، شاہ وگدا سب برابر ہیں۔

اسلام کا معاشی نظام اگر دیانتداری سے نافذ کر دیا جائے تو ایک ایسا ہموار معاشرہ پیدا ہو جائے گا۔ جہاں تمام طبقات باہمی محبت وسلوک وحقوق کی ادائیگی، خدمت اور موانست کی زندگی گذار سکیں گے۔ جہاں آقا و غلام کی تمیز نہیں ہوگی اور جہاں ہر شخص خوشحالی، فارغ البالی اور فراوانی کی زندگی گزار رہا ہوگا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام کی وسیع سلطنت میں کوئی زکوٰۃ قبول کرنے کے لائق محتاج نہیں رہا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی سلطنت میں، جو موجودہ مغربی پاکستان کی مشرقی سرحدوں سے لے کر اٹلانٹک تک اور دیوار چین سے لے کر وسط افریقہ اور اندلس تک پھیلی ہوئی تھی، کوئی نادار ایسا نہ ملتا تھا جسے زکوٰۃ وخیرات دی جا

سکے۔ یہ اسلامی معاشی نظام کی برکت تھی کہ جب تک مسلمانوں میں اسلامی اقدار کا پاس رہا، طبقاتی منافرت اور مالی حرص و آز کا جہنم وجود میں نہ آسکا۔ حاصل یہ ہے کہ ہمارے معاشی مسائل کا حل نہ سرمایہ داری میں ہے نہ اشتراکیت میں۔ ہم اپنی معاشی تعمیر نو صرف مذہب کے بتائے ہوئے خالص الٰہی اصولوں اور احکام کے مطابق کر سکتے ہیں، ورنہ ہر قدم مزید الجھنوں کا سبب بنتا جائے گا۔ اس سلسلے میں ہمیں بابائے ملّت قائداعظم کے وہ الفاظ یاد رکھنے چاہئیں جو انہوں نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی بنیاد رکھتے ہوئے یکم جولائی ۱۹۴۸ء میں اپنی آخری تقریر میں فرمائے تھے۔

''مغرب کے اقتصادی اصول ہمارے لئے عبرت آموز ہیں جن کی وجہ سے آج دنیا بحران کا شکار ہے۔ آپ کے تحقیقی ادارے کو چاہئے کہ وہ اسلامی نظریات پر سماجی اور اقتصادی زندگی کی بنیاد رکھے۔ ایک خوشحال اور مطمئن معاشرے کے لئے مغربی اصول کسی طرح مفید نہیں ہو سکتے۔ ہمیں تو ایک نئے طریق کار کو اپنانا چاہئے۔ جو انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔''

ملک میں جرائم کا جو رجحان اور لاقانونیت کا جو میلان پیدا ہو رہا ہے اس کا علاج مذہبی قوانین اور اسلامی شریعت کا نفاذ و اجرا ہے۔ اسلامی قانون و شریعت کے منافع اور اسلامی نظریہ عدل پر اس مختصر وقت میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم یہ بات بے محابہ (straight forward) عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ انسانی خود ساختہ قوانین کبھی عادلانہ نہیں ہو سکتے۔ نہ انصاف کے تقاضوں کو کما حقہ پورا کر سکتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہر شخص اور ہر انسانی طبقہ کے مخصوص رجحانات و میلانات، تقاضے و مفادات ہوتے ہیں جن سے وہ انسان ہونے کی حیثیت سے کلیتہً کبھی مبرا نہیں ہو سکتا۔ قانون ساز اداروں اور مجالس مقنّنہ کی روزانہ کی کارروائیاں انسان کی اس بارے میں کوتاہ رسی پر شاہد عدل ہے۔ ایک ملک کی قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ کوئی قانون بناتی ہے۔ وہ طبقہ جس کا وہاں غلبہ اور اکثریت ہوتی ہے، قانون سازی میں اپنے مفادات پر نگاہ رکھتا ہے۔ اگر انصاف ان کی راہ میں حائل ہوتا ہے تو تاویلات کے پردوں میں اسے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آمریت اور فاشزم میں شخص واحد کی انانیت قانونی قوت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اگر کوئی سرمایہ دار (capitalist) سرمایہ داری کی بے جا حفاظت کرتا ہے تو کمیونسٹ 'مزدور و کسان' کی حدود سے بڑھ کر رعایت کرتے ہیں۔ قانون تو وہ عادلانہ ہوگا جس میں کسی کی رعایت نہ ہو۔ ملکی رجحان نہ ہو، نسلی میلان نہ ہو، لونی (colour) پاس نہ ہو، علاقائی لحاظ نہ ہو، وطنی مفاد نہ ہو، طبقاتی عصبیت نہ ہو، غیر سے مخاصمت (conflict) نہ ہو، اپنے کی حمایت نہ ہو، کنبہ پروری نہ ہو، دوست نوازی نہ ہو، 'مفادات خاصہ' کی ناجائز نگرانی نہ ہو، قانون سازی میں مال و جاہ کی طلب نہ ہو، مدح و ذم (تعریف و برائی)

کی پروانہ ہو۔

غرض تمام مفادات سے بالاتر ہوکر اور ہر 'رجحان' سے 'تہی خاطر' وخالی دماغ ہوکر محض عدل وانصاف کی بقاء کیلئے قانون بنائے۔ یہ انسان کے بس کی بات نہیں بلکہ یہ تو اس ذات کا کام ہے جو سب تعلقات سے بری، کسی کا بیٹا نہ کسی کا باپ، نہ کسی کا رشتہ دار ہو۔ ہر انفعال (weakness) سے پاک ہو۔ خوف ورعایت سے مبرا، نسلی ولونی، ملکی وطنی بندشوں سے آزاد ہو، اور وہ ذات انسان کے غوامض واندروں اور اس کی جملہ ضروریاتِ انفرادی واجتماعی سے کلیتہً واقف ہو، عالم السرائر (غیبی دنیا) اور مستقبل کے جملہ کوائف و واقعات، حوادث و ضروریات کی جاننے والی ہو۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔

اللہ تعالیٰ جو قانون دے گا، وہ سب انسانیت بلکہ پوری مخلوق کو سامنے رکھ کر اور مستقبل کے وقائع و احوال کو جان کر دے گا، جس میں کسی کی رعایت نہیں ہوگی۔ نہ کسی کا 'خوف' عدل میں مانع ہوگا۔ وہ ہر ذاتی مفاد سے خالی ہوکر محض مخلوق پروری اور انسانیت کی دادرسی کے لئے دیا جائے گا۔ اس میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ اس میں استحصال وجبر کے چور دروازے نہیں ہوگے۔

غرض ملک میں عدل وانصاف کا چلن صرف اسلامی شریعت کے نفاذ سے ہوسکتا ہے۔ تعمیر نو میں مذہبی قانون کے نفاذ کی اس وجہ بھی ضرورت ہے کہ 'قانون' کی بالادستی کا تصوّر احترامِ قانون پر مبنی ہے اور وہ قانون صرف 'خدائی قانون' ہی ہے، جسے پاکستان کے مسلمان غیر شعوری طور پر بھی مقدس مانتے ہیں، قانونِ اسلامی کے جملہ فوائد بیان کرنے کی گنجائش نہیں تاہم سمجھتا ہوں کہ یہ دو باتیں بھی تعمیرِ نو کے علم برداروں کی ثاقب نگاہوں کے لئے کافی ہوں گی۔

طوفان اشک لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

اس ضمن میں ایک اور بنیادی مسئلہ 'قومی اخلاق' کی بقا وتعمیر کا ہے۔ آج ملک میں بددیانتی، رشوت، گراں فروشی، ذخیرہ اندوزی، بے حیائی، ظلم وزیادتی کے جو بے شمار واقعات ہورہے ہیں ان کا علاج بھی اسلامی قانون کا اجرا اور اخلاق کو مذہب کی گرفت میں دینا ہے۔

چوتھا بڑا مسئلہ نئی نسل کو اسلامی مزاج پر قائم رکھنا ہے۔ جیسے کہ عرض کر چکا ہوں، مسلمان اور اہلِ پاکستان کوئی نسلی وطنی قومیت وملک نہیں بلکہ ان کا وجود وبقا صرف اسلام سے وابستہ ہے۔ نئی پود جس طرح اسلامی عقائد واعمال سے عاری اور مذہبی اقدار سے بے نیاز ہوتی جارہی ہے، وہ ایک نامعلوم عالمگیر ارتداد سے کم نہیں۔

اس ہمہ گیر غفلت کا نتیجہ پاکستان اور نظریۂ پاکستان کی تباہی پر منتج ہوسکتا ہے اسلئے وقت کی سب سے بڑی پکار ہے کہ ہم ہر پاکستانی کو عموماً اور نئی پود کو خصوصاً اسلام کے لافانی اور بے مثال دین واقدار سے آگاہ اور اس پر عمل پیرا کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے ہمیں اپنے پورے تعلیمی وتربیتی نظام کو ہر سطح پر اسلامی تعلیمات ومزاج کے مطابق بنانا ہوگا۔ آج تک ہم نے اپنے تعلیمی نظام میں کوئی اہم اور بنیادی تبدیلی نہیں کی۔ انگریز نے اپنے استعماری مفادات کے لئے جس نظام تعلیم کو رائج کیا تھا، اسی تقویمِ پارینہ (old calendar) کو ہم آنکھوں سے لگائے ہوئے ہیں اور اسی صد چاک قبا (سو جگہ سے پھٹی قمیص) پر پیوند در پیوند لگاتے جاتے ہیں، جب تک نظامِ تعلیم میں بنیادی اصولی اور اجتہادی تبدیلیاں (جو اسے ہر سطح پر اسلامی مزاج سے ہم آہنگ کردیں) نہیں کی جائیں گی، ملّتِ پاکستانیہ کا بحیثیت مسلمان کے باقی رہنا خام خیالی اور فریبِ نفس ہے۔ اس سلسلے میں سرکاری ملازمین اور عام اہل کاروں کی دینی تربیت کا مسئلہ ہے۔ کسی ملک کی تعمیر میں سرکاری ملازمین کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ آج تک ہمارے ہاں یہ طبقہ اِلاّ ماشاء اللہ انگریز کے بتائے ہوئے پیش پا افتادہ (foot steps) راستے پر گامزن ہے۔ شخصی مفاد قومی مفاد پر غالب آجاتا ہے اور 'دیانت وامانت' کے مقدس قلعہ میں 'خوف ولالچ' سے رخنے پڑ جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ وہ ہمہ گیر خرابیاں ہیں جس سے ہر شخص نالاں ہے۔ ضرورت ہے کہ سرکاری ملازمین کی تربیت میں اسلامی اقدار کو اس طرح سمو دیا جائے کہ خوفِ خدا اور تقویٰ انہیں ہر غلط جنبشِ قلم اور لغزشِ قدم سے روک دے۔ خشیتِ الٰہی 'رشوت وناجائز آمدنی' کے بارے میں ان کے ہاتھوں کو شل کردے اور کسی کا خوف ودہشت حق گوئی اور جائز دادرسی میں مانع نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہی اور مخلوق کے سامنے شرمندگی کا تصوّر ان پر اس طرح مستولی (چھایا) ہو کہ وہ قومی، ملکی اور پبلک مفادات کو کسی صورت میں پسِ پشت ڈالنے کی جرأت وہمت نہ کرسکیں۔ ان کی زندگی کا مقصد رضائے حق کے حصول کے لئے خدمت خلق ہو۔ یہ بات تبھی پیدا ہوسکتی ہے جب ہم اپنی اعلیٰ سروسوں سے لے کر ادنیٰ ملازمتوں تک دینی ذہن ومزاج کو عام کردیں اور اسلامی نظریہ کے مطابق ملازمین محض خدمتِ خلق اور ادائیگیٔ حقوق کو اپنا فریضہ سمجھیں۔ آج حقوق طلبی کی فضا نے ملک کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اس مشکل کا حل 'حقوق رسانی اور ادائیگی حقوق' کے اسلامی جذبہ ہی سے ہوسکتا ہے۔ غرض سرکاری ملازمین کے بارے میں جو آج ہنگامہ بپا ہے اس کا علاج صرف مذہبی تربیت اور اسلامی ذہن ہی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ہماری شیر دل افواج کی ہمت وجرأت اسلامی جذبۂ شجاعت اور ولولہ شہادت سے ہی بڑھ سکتی ہے۔

اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں کہ 'قومی تعمیرنو میں مذہب کی اہمیت' کے تمام پہلوؤں پر مختصر گفتگو بھی کی جاسکے، تاہم آخر

میں ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں، وہ اپنے 'ذرائع ابلاغ' کو 'اسلامی بنانا' ہے۔ آج ہمارے قومی کردار و اخلاق کی تعمیر و تخریب میں ٹی وی، ریڈیو، اخبار و رسائل وغیرہ جو اہم حصہ ادا کر رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عمومی ذہن پر ان کا اثر جتنا دور رس اور نتیجہ خیز ہے اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ جملہ 'ذرائع ابلاغ' کو مذہبی حدود و قیود کا پابند اور خالص اسلامی ثقافت اور اسلامی تعلیمات کے پرچار کا ذریعہ بنایا جائے۔ کسی نظریاتی مملکت کی تعمیر نو اسی وقت ممکن ہے جب ان تمام چور دروازوں پر سنگین پہرہ بٹھا دیا جائے جہاں سے نظریہ کی تخریب کا اندیشہ ہو۔

پاکستان اور اس کے باشندے ایک درخشندہ مستقبل سے اسی صورت میں ہمکنار ہو سکتے ہیں کہ ہماری تعمیرِ نو کی بنیاد اسلامی زریں تعلیمات اور مذہب کے تابندہ و روشن احکام پر استوار کی جائے۔

غرض پاکستان کی بقاء و ترقی تمام تر 'مذہب' پر مبنی ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی تعمیر نو کے خاکہ میں سراسر اسلامی رنگ بھرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ پاکستان ایک مضبوط مملکت بن سکے اور پاکستانی ملّت ایک پُرشکوہ، عظیم اور مثالی امّت کی حیثیت سے دنیا میں ابھر سکے اور آخرت میں بھی سرخرو ہو سکے۔ تاکہ اس کے قیام کا اصل مقصد پورا ہو، اور پاکستان اسلامی تہذیب و تمدن قانون عدل و انصاف اور معاشی ہمواری اور معاشرتی زیبائی کا 'دیرینہ' نظارہ دنیا کو دکھا سکے۔

اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے اور 'تعمیرِ نو' کے ناخداؤں (ذمہ داروں) اور ملّت کے رہنماؤں کو توفیق بخشے کہ پاکستان کی تعمیرِ نو اسلام کی عظیم تعلیمات کے مطابق کر سکیں۔

(بقیہ۔ صفحہ نمبر ۱۹ سے آگے)

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ موت کی سختی، موت کا جھٹکا آ گیا، حق کے ساتھ، موت کا جھٹکا سر پر آ پہنچا، یہ وہی ہے جس سے تو گھبراتا تھا جبکہ اس نے تو آنا ہی تھا، تو چاہے یا نہ چاہے اس نے تو آنا ہی آنا تھا، اور اس کا ایک وقت مقرر تھا۔ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ نہ ایک ساعت پہلے ہونا تھا نہ بعد میں۔ اس نے تو ہونا ہی تھا۔

اب بھی وقت ہے، بیدار ہو جاؤ!

لٰہذا اگر اس موت سے پہلے تو بیدار نہ ہوا اور تو نے اپنے آپ کو درست نہ کیا تو پھر اب تو درستگی کے حالات ہی نہ رہے میرے بھائی! لٰہذا اس درستگی کی طرف تو آ جا! اور توبہ تائب ہو کر اِن فضولیات، کوتاہیوں سے نکل آ! اور نکلنے کے بعد تو اپنا تعلق بنا لے اللہ کے ساتھ۔ ہمارے ایک بزرگ ہوتے تھے لالہ سحر گل صاحب، وہ کہا کرتے تھے کہ خدائے سرہ جوڑہ جاڑہ اُوکه! (خدا تعالیٰ کے ساتھ بنا لے) چاہے تو تعلق درست کرتا ہے یا نہیں کرتا لیکن پیشی کے لیے اُسی کی جانب جا رہا ہے اور اسی کے حضور حساب کتاب کے لیے تو نے کھڑا ہونا ہے۔ لٰہذا اس پر غور کر لے، فکر کر لے اور اس کے لیے تیاری کر لے۔ اللہ پاک عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

عمارتِ کعبہ اور حقیقتِ کعبہ

(بیان حضرت ڈاکٹر حاجی فدا محمد صاحب دامت برکاتہٗ بمورخہ ۲۱ستمبر ۲۰۱۳ء۔ضبط وترتیب: عمر فاروق صاحب)

اَلحمدُ لِلّٰہِ نَحمَدُہٗ وَنَستَعِینُہٗ وَنَستَغفِرُہٗ وَ نُوءُ مِنُ بِہٖ وَ نَتوَکَّلُ عَلَیہ وَ نَعُوذُ بِااللّٰہِ مِنُ شُرُوُرِاَنفُسِنَا وَ مِن سَیِّاٰتِ اَعُمَالِنَا مَنُ یَّھدِہِ اللّٰہُ فَلا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنُ یُّضُلِلُہٗ فَلا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشُھَدُ اَنُ لَّا اِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحُدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ وَ نشھدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبُدُہٗ وَ رَسُولُہٗ اَمَّا بَعُدُ فَقال اللّٰہ تعالیٰ جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعُبَۃَ الْبَیتَ الْحَرامَ قِیَامً لِّنَاسِ وَ اَمُنَا. قال اللّٰہ تعالیٰ وَ لِلّٰہِ عَلَیَ النّاسِ حِجُّ الُبَیتِ مَنِ اسُتَطَاع اِلَیہِ سَبِیلًا وَمَنُ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الُعَالَمِین. قَالَ اللّٰہ تعالیٰ لَن یَّنالّ اللہُ لُحُومُھا وَلا دِمَآءُ ھا وَلٰکِن یَّنَالُہُ التَّقوٰی مِنُکُم صدق اللّٰہ العظیم. رب اشرح لی صدری ویسّر لی امری و احلل عُقدۃ من الّسانی یفقھو قولی.

ایک ہی بات بار بار بیان کرنے میں حکمت

محترم بھائیو دوستو! یہ حج اور قربانی کے دن ہیں اس لیے یہی مضمون سامنے آیا ہے اسی کو بیان کر لیتے ہیں۔ وَذَکِّر فَاِنَّ الذِّکریٰ تَنُفَعُ الُموءِ مِنِین کہ یاددہانی کرتے رہیئے، نصیحت کرتے رہیئے، نصیحت مومنین کو فائدہ دے گی۔ ایک بات اگر ہمیں آتی بھی ہو، ہمیں پوری طرح یاد بھی ہو، اس کو جب بار بار بیان کرتے ہیں تو یہ اس لیے ہوتا ہے کہ یاددہانی باطن پر ہو جائے۔ باطن میں، نفس میں یاددہانی ہو جائے تاکہ اس کے نتیجے میں انسان کو عمل کی توفیق ہو۔ عمل کے بغیر کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا کیونکہ نتائج اعمال پر مرتب ہوتے ہیں۔

عالمی امن اور بقاء کا دارومدار

کعبہ شریف کے بارے میں آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عزت والے، حرمت والے گھر، اپنے گھر کو لوگوں کے قائم رہنے کے لیے اور امن قائم رہنے کے لیے بنایا ہے۔ اللہ پاک نے عالمی امن اور بقاء کا دارومدار بیت اللہ شریف پر رکھا ہے۔ ایک تو عمارتِ کعبہ ہے اور ایک حقیقتِ کعبہ ہے۔ عمارتِ کعبہ تو وہ پتھروں کا گھر ہے کہ اتنا لمبا، اتنا چوڑا، اتنا اُونچا، اس مقام پر بنا ہوا ہے۔ یہ ایک علامت اور نشانی ہے اُس حقیقت کی جو اس کے پیچھے ہے۔

انسان ظاہر پرست ہے

انسان چونکہ مادی ہے، اس لیے یہ دیکھنے، سننے والی چیزوں سے متاثر ہوتا ہے جو اس کے سامنے ہوں، نظر آ رہی ہوں، اُن کو دیکھ رہا ہو۔ اسی بناء پر انسان بت پرستی میں بتلا ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام ایک سفر میں تھے تو راستے میں اُنھوں نے دیکھا کہ ایک جگہ پر کچھ لوگ بت کو پوج رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر بنی اسرائیل نے کہا کہ جیسے ان کے لیے اِلٰہ ہے ویسے ہی ہمارے لیے بھی ایک اِلٰہ بنا دے۔ تو گویا سامنے کوئی تمثیل ہو۔ یہ انسان کی کمزوری ہے، بشری

کمزوری ہے، اسی کی وجہ سے یہ شرک میں مبتلا ہوتا ہے اور شیطان اس کو کہیں دور جا کر پھینکتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم پر حیرت ہوئی کہ تم نے کتنے معجزے دیکھے، سمندر سے پار ہوئے، فرعون تمہارے سامنے غرق ہوا، ان سارے حالات کے دیکھنے کے بعد بھی تمہیں تسلی نہیں ہے، پھر بھی تمثیل کو چاہتے ہو؟

نہی عن المنکر میں احتیاط

ایک مرتبہ موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر گئے خاص اللہ سے ملاقات کے لیے تو پیچھے سے سامری نے اسی انسانی کمزوری کے تحت، ان زیورات سے جو بنی اسرائیل فرعونیوں کے لے کر آئے تھے، سونے کا بچھڑا بنا دیا۔ ہارون علیہ السلام کو یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ اس طرح دھوکہ سے، مال کی خاطر اصول کو چھوڑ دینے سے انسان کا فہم خطا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ایسے انسان کو تو اللہ کی معرفت ہی حاصل نہیں، ان کو بڑا افسوس ہوا اور ساری قوم سے زیورات جمع کروانے کو کہا۔ ان زیورات کو جمع کیا گیا۔ ان کو ایک گڑھے میں ڈالا اور اس پر آگ جلائی تا کہ اس کی کوئی حیثیت ہی نہ رہے۔ سامری آیا اور اس نے کہا کہ میں بھی اپنا سونا ڈالتا ہوں مگر میری ایک مراد ہے، اس کے لیے آپ دعا کریں گے۔ اس نے اپنے دل میں یہ مراد مانی کہ اس پگھلے ہوئے سونے سے میں بچھڑا بناؤں اور وہ بولنے لگے اور آواز نکالنے والا ہو جائے۔ دعا قبول ہوئی، بچھڑا بنا اور وہ بولنے لگا اور سامری نے اسے پرستش کے لئے کھڑا کر دیا اور ساری قوم کو پرستش پر ڈال دیا۔ تو ہارون علیہ اسلام نے جب یہ دیکھا کہ اب اگر میں اس پر نہی عن المنکر کرتا ہوں تو اس نہی عن المنکر میں اگر میری جان بھی چلی جائے تب بھی یہ برائی تو ختم ہو نہیں رہی بلکہ فساد اتنا کھڑا ہو رہا ہے جس کا کوئی حل ہی نہیں ہوگا۔ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی آمد کا انتظار کیا۔

توحید اور دین کا پھیلاؤ انبیاء کے خاص توجہ کے مضمون ہوتے ہیں

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو جن باتوں سے خاص مناسبت ہوتی ہے ان میں ایک توحید ہے۔ توحید اور دین کا پھیلاؤ، یہ انبیاء علیہم السلام کے خاص توجہ کے مضمون ہوتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائے تو ان کو اتنا غصہ ہوا کہ آ کر ہارون علیہ السلام کو سر سے اور ڈاڑھی سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور جھنجھوڑا اور کہا کہ تُو دیکھ رہا تھا اور قوم شرک میں مبتلا ہو گئی اور تیرے سامنے یہ سب کچھ ہوا؟ تو ہارون علیہ اسلام نے جواب دیا کہ اے میرے بھائی جان! مجھے بالوں سے اور ڈاڑھی سے نہ پکڑ! حالات ایسے تھے کہ واقعی یہ سب میں نے دیکھا، واقعی اس پر افسوس ہونا ہی تھا لیکن اس دوران اگر میں کوئی اقدام کرتا اور آگے بڑھ کر اس کو روکنے کی کوشش کرتا، نہی عن المنکر کے لئے آگے بڑھتا تو اِنِّی خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَلَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِیۡ یعنی حالات ایسے ہو گئے تھے کہ اگر میں کوئی قدم اٹھاتا تو اس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ پیدا ہو جاتا، فساد ہو جاتا، وہ گناہ تو رُکتا نہیں بلکہ الٹا فساد پیدا ہو جاتا۔ اس

لئے میں نے آپ کے آنے کا انتظار کیا۔

منفی ہتھکنڈوں سے حاصل کردہ لیڈری کا عبرتناک انجام

تو اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو جو حال، جو جلال نصیب فرمایا تھا اہلِ علم کو معلوم ہے۔ عزرائیلؑ کو ایسا تھپڑ مارا تھا کہ آنکھ ہی نکال دی تھی۔ حالتِ جلال میں تورات کی تختیوں کو ایک طرف پٹخا، ہارونؑ کو بالوں سے کھینچا، جب یہ ڈانٹ ڈپٹ ہوئی تو ساری قوم پر یہ دیکھ کر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ سب بولنے سے ہی رہ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُس بچھڑے کو اٹھا کر زمین پر دے مارا اور سامری کے لیے بددعا کی یہاں تک کہ وہ ایک ایسی پراسرار بیماری میں مبتلا ہوا کہ جب کوئی اس کے قریب آتا تو اسے تکلیف ہوتی تھی، کوئی اس کو چھوتا تو اسے تکلیف ہوتی، یعنی کہ جس لیڈرشپ کو حاصل کرنے کے لئے اور جس قیادت سیادت کے لیے اس نے اللہ کے حکم کو توڑا تو اللہ پاک نے ایسے حالات پیدا کر دئے کہ لیڈری چونکہ انسانوں کو وجہ سے ہوتی ہے تو جب انسان قریب آنے لگتے تھے تو اسے تکلیف ہوتی تھی۔

حقیقتِ کعبہ کیا ہے؟

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ انسان ظاہر پرست ہے۔ اسی وجہ سے اللہ پاک نے اس کو صورتِ کعبہ عطا فرمائی۔ اور حقیقتِ کعبہ تو ذاتِ ذوالجلال کی وہ تجلیات ہیں جو اس جگہ آتی ہیں اور انسان کے باطن کا ذاتِ ذوالجلال کے ساتھ جو تعلق ہے وہ حقیقتِ کعبہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بزرگ طواف کر رہے تھے اور دیکھا کہ ایک عورت بدحال، مجذوبیت کی حالت میں، برے حال میں ہے، وہ بھی طواف کر رہی تھی۔ ان بزرگ کو حیرت ہوئی کہ یہ کون ہے؟ تو وہ عورت بہت زیادہ معرفت والی تھی، اُس نے کہا کہ تُو اللہ کا طواف کرتا ہے کہ بیت اللہ کا طواف کرتا ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم تو بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ وہ بولی کہ یہ کیا طواف ہوا! یہ تو محض ظاہری صورت ہے، طواف تو ذاتِ ذوالجلال کا ہے! اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ جس نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا اس نے گویا اللہ پاک کے داہنے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا ہے۔

سنگِ سیاہِ در جو تھا، دستِ مصافحہ بنا
جھانک رہی ہیں حقیقتیں پردۂ مجاز میں

یعنی مجاز کے پردے میں اس کی حقیقت جھانک رہی ہے۔ دروازے کا سیاہ پتھر جو تھا، حجرِ اسود، وہ ہاتھ بنا جس سے ہاتھ ملایا جاتا ہے۔

حجر اسود کے چومنے کی لذت اور کیفیت

تو کیا تجھے کبھی محسوس ہوا کہ اب میرا مصافحہ ہوا اور میں نے ذاتِ ذوالجال کے داہنے ہاتھ کو چوما! سبحان

اللہ! یہ کیفیت اگر تجھے نصیب ہوجائے تو وہاں پر تیری جان نکل جائے! دنیا کے مُردار محبوب، جن کو اگر مرنے کے بعد تین دن گزر جائیں تو اتنی بدبو اور تعفن ہو کہ دیکھنے کے قابل ہی نہ رہیں اور وہاں پر کھڑا ہونے کی گنجائش نہ رہے، کو چومنے میں تجھے اتنا لطف آتا ہے کہ تو اس کے لئے جان دینے کو تیار ہوجاتا ہے۔ تو اس سارے حسن و جمال کو جس ذاتِ ذوالجلال نے پیدا فرمایا ہے اس کے دائیں ہاتھ کے چومنے کی کیفیت! سبحان اللہ! تو یہ حقیقتِ کعبہ ہے۔

حطیم چمٹ جانے کی جگہ ہے

فرمایا کہ حطیم، حجرِ اسود اور بیت اللہ شریف کے دروازے کے درمیان جو جگہ ہے، یہ چمٹنے کی جگہ ہے، اس پر چمٹ کر دعا مانگتے ہیں۔ سارے بزرگوں نے لکھا ہے کہ حطیم پر ہم نے جو دعا مانگی قبول ہوئی کیونکہ وہ قبولیتِ دعا کی خاص جگہ ہے۔ اور غلافِ کعبہ کو پکڑنا ایسا ہی ہے گویا اُس خاص ہستی جس سے بہت زیادہ فوائد مفادات ملنے کی اُمید ہو اُس کا دامن ہاتھ میں آگیا ہے اور اُسے پکڑ لیا ہے۔ اگر تجھے یہ بات نصیب ہوجائے تو تیری تو جان نکل جائے!

دل کو تھاما اُن کا دامن تھام کے
ہاتھ نکلے دونوں اپنے کام کے

حقیقتِ کعبہ کا تذکرہ اور رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کا واقعہ

کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ ایک بزرگ گئے تو اُنھوں نے بیت اللہ شریف کو وہاں پر نہ پایا۔ اُنھوں نے سوال کیا کہ میں بیت اللہ شریف کو یہاں پر نہیں پارہا ہوں۔ جواب ملا کہ ایک بوڑھی عورت آرہی ہے اور بیت اللہ اُس کے استقبال کو گیا ہوا ہے۔ ان کو بڑی حیرت ہوئی۔ پھر پتہ چلا کہ رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا تشریف لارہی ہیں۔ (جب عقل ماری جاتی ہے اور فہم ختم ہوجاتا ہے تو پھر آدمی ایسی اول فول باتیں کرتا ہے کہ کعبہ تو وہاں پر موجود تھا، سب لوگ دیکھ رہے تھے اور نعوذ باللہ یہ ایسی بات کہتے ہیں کہ کعبہ وہاں نہیں تھا!) ہمارے حضرت مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ صورتِ کعبہ تو وہیں پر تھی، یہ تذکرہ حقیقتِ کعبہ کا ہے۔ حقیقتِ کعبہ تو وہ انوارات اور تجلیات ہیں جن کا اس مقام پر نزول ہوتا ہے اور حقیقتِ کعبہ تو قلب کا وہ تعلق ہے جو ذاتِ ذولجلال کے ساتھ ہے، جس کے لیے یہ محل یہ جگہ بنادی گئی ہے کہ رُخ یہ ہے، جگہ یہ ہے، بس اس کی جانب رخ کرنا ہے۔ یعنی حقیقتِ کعبہ ذاتِ ذوالجلال کے ساتھ جڑ جانا ہے کہ دل سے ساری مخلوق کا رعب نکل گیا، ساری مخلوق کا خوف نکل گیا، ساری مخلوق کی محبت نکلی ہوئی اور بس فقط اللہ پاک کی محبت، اللہ پاک کے رعب، اللہ پاک کے خوف میں آیا ہوا، اللہ پاک کی محبت چھائی ہوئی اور سمائی ہوئی، یہ حقائق ہیں۔ یہ حقیقتِ کعبہ ہے جو قلب میں داخل ہوتی ہے اور اس بات کے لیے اجتماع کی جگہ، جمع ہونے کی جگہ اور ایک رُخ متعین ہوگیا۔ اس لیے قربِ قیامت میں حقیقتِ کعبہ پہلے

اُٹھ جائے گی پھر عمارت کعبہ کو اُٹھا دیا جائے گا، کہ لوگوں کا اللہ کی ذات کے ساتھ جو تعلق تھا اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حقیقتِ توحید کیا ہے؟

پچھلے دنوں اسلام آباد میں ایک کانفرنس کر رہے تھے... یہ دنیا داروں کی کانفرنسیں ہوتی ہیں تو ان میں مولویوں کو بھی اپوائنٹمنٹ دے کر کانفرنسیں کر لیتے ہیں... تو اس کانفرنس میں بیان کے لیے مجھے بھی بلایا گیا۔ اس میں ہر طرح کے علماء آئے ہوئے تھے۔ مجھ سے تعارف کروایا کہ یہ توحیدی ہیں، یہ اشاعت والے ہیں، یہ فلاں پارٹی والے ہیں۔ میں نے اپنے بیان میں کہا کہ قبر پرستی نہ کرو، غیرُ اللہ سے مرادیں نہ مانگو وغیرہ یہ سب باتیں ضروری توحید ہے، کرنی چاہئیں، لیکن میرے بھائی حقیقتِ توحید تو یہ ہے کہ جس وقت حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کو حجاج بن یوسف کے سامنے پیش کر دیا گیا اور جلاد ہاتھ میں ننگی تلوار لئے ہوئے کھڑا ہوا اور حجاج نے کہا کہ ابھی میں تیری گردن اُڑانے والا ہوں، سر قلم کر رہا ہوں، تو انھوں نے جواب میں فرمایا: ''اگر میں تجھے اپنی زندگی اور موت کا مالک سمجھتا تو میں تمھیں اپنا معبود نہ بنا لیتا!'' یعنی کہ اس حال میں بھی ہوش وحواس بحال ہیں اور غیرُ اللہ کا ذرا خوف تک نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ جس وقت تلوار ماری گئی تو گردن سے بہت خون نکلا۔ حجاج نے شاہی طبیب سے پوچھا کہ ہم جب لوگوں کو قتل کرتے ہیں تو خون ہی نہیں نکلتا لیکن اس آدمی کا تو بہت ہی خون نکلا، تو اس نے جواب دیا کہ باقی لوگوں کا خون خوف کے مارے خشک ہو چکا ہوتا ہے جبکہ اس آدمی کے دل پر آپ کا ذرا بھی خوف نہیں تھا۔ میرے بھائی حقیقتِ توحید یہ ہے!

اپنی توحید کا امتحان کیسے لیں؟

حقیقتِ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ اسے برتا جائے۔ جب وقت آتا ہے تو وہ تیرا امتحان لیتی ہے کہ آیا اب تو اللہ کے لیے کرتا ہے کہ غیرُ اللہ کے لیے کرتا ہے، اب تو نے اللہ کو ترجیح دی کہ غیرُ اللہ کو ترجیح دی، اب تو نے اللہ کے حکم کو ترجیح دی یا نفس کے مفاد کو، اس جگہ پر آدمی پاس فیل ہو جاتا ہے۔ تو ان سارے اہلِ علم سے میں نے کہا کہ اس جگہ اپنا امتحان خود ہی لیا کریں۔ صاف پتہ چل جائے گا کہ تم میں سے کتنے توحید کی حقیقت کو حاصل کئے ہوئے ہو، کتنے پاس ہوئے، کتنے فیل ہوئے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ بعض قلوب بیت اللہ شریف سے دُور دراز ہوتے ہوئے بھی حقیقتِ کعبہ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتے ہیں جبکہ کئی ہماری طرح دنیا دار ہیں کہ وہاں بیت اللہ کے گرد طواف کرتے ہوئے بھی دل دنیا سے، غیرُ اللہ، بھرا ہوا اور دل میں اللہ کے غیر کا خوف، اللہ کے غیر کا شوق، اللہ کے غیر کی محبت، اللہ کے غیر کا رعب چھایا ہوا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ بیت اللہ کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔

بودی دلیل کے ذریعے حج اور قربانی پر اعتراض اور اُس کا جواب

دوسری آیت جو میں نے پڑھی وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا کہ لوگوں کے گردنوں پر

یہ بات لازم کردی گئی ہے کہ وہ اللہ کے گھر کا حج کریں گے۔ اگر آدمی مالدار ہو، صاحبِ حیثیت ہو اور حج کے لیے نہ جا رہا ہو، تو میں تو اس بات سے ڈرتا ہوں کہ یا اللہ ایمان سلب ہونے سے محفوظ فرما۔

میرے پاس ایک لیڈی ڈاکٹر صاحبہ آئی اور کہا کہ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں اور یہ حج کرتے پھرتے ہیں، سارا پیسہ حج پر لگا دیتے ہیں، اس وقت باقی ڈاکٹر صاحبان بھی بیٹھے ہوئے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس کا جواب دیں کہ واقعی یہ پریشانی والی بات ہے۔ میں نے کہا کہ اب میں اس بے چاری کی بات کا کیا جواب دوں، وہ اپنے خیال میں گڑھی ہوئی ایک دلیل کے ذریعے سے اہم فرض کا رد کر رہی ہے، دلیل اگرچہ بودی اور کمزور ہے لیکن میں کوئی بات کروں اور وہ کھلم کھلا رد کر دے تو اس سے تو وہ کفر میں چلی جائے گی۔

اس بات کو میں نے غزالی رسالے میں شائع کیا کہ اگر تو اتنا سخی ہے اور لوگوں کی پریشانی کا تجھے اتنا غم ہے کہ تو نے اپنا سارا مال انھیں دے دیا ہے اور اب تیرے پاس کچھ بھی نہ رہا، تو پھر تو بے شک حج نہ کر! لیکن تین چار لاکھ تو نے دے دئے اور پھر بھی صاحبِ نصاب ہے تو پھر تو بچ نہیں سکتا، تب بھی تجھ پر حج فرض ہے۔ بچ نہیں سکتے۔

ایک اور ڈاکٹر صاحب میرے پاس آیا اور بولا کہ قربانی کے چار ہزار کے خرچ کو اگر میں اپنے محلے کی ایک غریب عورت کو دے دوں تو کیا یہ اچھا نہیں ہوگا؟ تو میں نے جواب دیا کہ ماشاءاللہ آپ ضرور چار ہزار دیں لیکن اس کے بعد بھی اگر آپ صاحبِ نصاب ہیں تو قربانی تب بھی کرنی پڑے گی! البتہ اگر آپ اتنے سخی ہیں کہ آپ نے سارا مال تقسیم کر دیا اور اس کی وجہ سے آپ صاحبِ نصاب نہ رہے تب ٹھیک ہے پھر قربانی نہ کریں۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا سٹیٹ آرڈر

تو جس آدمی کا بس ہو اور وہ حج کے لیے نہ جائے تو اس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ مرضی ہے اس کی یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر مرے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنا سٹیٹ آرڈر (حکومتی گشتی مراسلہ) شائع کیا تھا کہ جس آدمی پر حج فرض ہو اور وہ حج نہ کرے تو اس پر جزیہ مقرر کیا جائے (جو اسلامی ریاست میں رہنے والے کافروں پر مقرر ہوتا ہے) تو یہ اتنی ضروری بات ہے میرے بھائی!

مرد و عورت کے بالغ ہونے کی عمر کا دورانیہ

انگریزی چودہ سال سات ماہ دس دن اور اسلامی پندرہ سال (۱۵) کی حد تک عمر ہونے پر مرد بالغ ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی کو اس سے پہلے بلوغت کے آثار ظاہر ہو جائیں تو انگریزی بارہ سال سات ماہ بیس دن یا اسلامی تیرہ سال (۱۳) پر بالغ ہو گیا۔ اب اگر یہ صاحبِ نصاب ہے تو حج کرے گا اور جتنی دیر کرے گا اتنا ہی عمل میں تاخیر کا مجرم ہوتا رہے گا، اس کو فی الفور حج کرنا چاہیئے۔

اورعورت کے بالغ ہونے کی عمر کا دورانیہ انگریزی چودہ سال سات ماہ دس دن یا پندرہ (۱۵) سال شرعی سے لے کر آٹھ سال نو ماہ انگریزی یا نو سال شرعی (۹) ہے۔اسی لیے اگر عورت کی عمر ۸ سال ۹ ماہ ہو جائے تو پھر پردہ فرض واجب کے حکم میں آجاتا ہے،اس کے بعد پھر کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے۔

قربانی کے حصے کا تعین ضروری ہے

اور قربانی کے بارے میں یہ ہے کہ اگر گھر میں تمام افراد صاحبِ روزگار ہیں تو سب کو قربانی کرنی پڑے گی۔بعض لوگ تو گھر کے سارے افراد سے پیسہ جمع کر کے ایک ہی قربانی کر دیتے ہیں جس میں یہ تعین ہی نہیں کرتے کہ یہ حصہ کس فرد کا ہے،تو ان کا حصہ مہمل ہوگیا۔اور اگر کسی قربانی میں ایک بھی حصہ مہمل ہے تو اس ایک مہمل حصے کی وجہ سے قربانی میں شریک باقی تمام افراد کی قربانیاں بھی ادا نہ ہوں گی۔

خراب عقائد اور حرام آمدنی والوں کو اپنے ساتھ قربانی میں شریک مت کرنا

اس لیے قربانی میں حصہ ڈالتے وقت خاص طور سے یہ احتیاط بھی کرنی ہوتی ہے کہ قربانی میں شریک افراد میں سے کوئی حرام کمائی یا آمدنی والا نہ ہو یا خراب عقائد والا نہ ہو۔یعنی کہ آدمی نماز تو پڑھتا ہے، حج عمرہ بھی کرتا ہے لیکن اس کے عقائد درست نہ ہوں، اس کے عقائد غامدی کے ہوں، اس کے عقائد پرویزیوں کے ہوں، اس کے عقائد قادیانیوں کے ہوں، اس کے عقائد الہدیٰ والوں کے ہوں، اس کے عقائد عثمانی گروپ کے ہوں تو ان کا اسلام تو ثابت نہ ہوا۔اسی طرح سے یہ بھی احتیاط کرے کہ آدمی شیعہ نہ ہو۔اگر کسی نے ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ قربانی میں حصہ دار کیا تو اس کی اپنی قربانی بھی خراب ہوگئی!

قربانی کے گوشت کو معاوضے میں دینا درست نہیں

اسی طرح اگر قصاب سے یہ کہا کہ کتنے پیسے لو گے اور مثلاً وہ کہے کہ ہزار روپے اور آپ نے کہہ دیا کہ ہم تو آٹھ سو روپے دیں گے کیونکہ تین چار سو کا تو آپ گوشت بھی لے جاتے ہیں۔اس طرح سے گویا آپ نے گوشت کو معاوضے میں کر دیا تو اس کی وجہ سے آپ کی قربانی بھی خراب ہوئی اور آپ کے تمام حصہ داروں کی بھی!

قربانی کے کھال کا درست استعمال ضروری ہے

اسی طرح کھال کا صحیح جگہ استعمال بھی بہت ضروری ہے۔کراچی میں غنڈوں کا ایک گروہ ہے۔ایک ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنا قصہ سنایا کہ میں ایم فل کے سلسلے میں کراچی میں مقیم تھا۔عید کے دن وہاں پر قربانی کی۔جب کھال اتاری تو ایم کیو ایم کا ایک آدمی کلاشنکوف لئے ہوئے آگیا اور کہا کہ کھال دو! میں نے اس کا حلیہ دیکھ کر اس سے کہا کہ کھال آپ کو کیسے دیں؟ تو اس نے آگے سے جواب دیا کہ اپنی کھال دیتے ہو یا یہ! تو اس ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے

کہا کہ یا اللہ! میں تو مسافر آدمی ہوں، اب میں کیا کروں۔ پھر میں نے اتنے روپے صدقہ کر دیئے تاکہ قربانی خراب نہ ہو۔ جب اعمال خراب ہوتے ہیں تو اللہ پاک ایسا عذاب مسلط کرتے ہیں۔

کراچی میں جاری خون ریزی کی وجہ

جب پردے میں اور عورت مرد کے اختلاط میں بے احتیاطی عام ہو جائے تو وہاں کشت وخون کی شکل میں اللہ کا عذاب مسلط ہوتا ہے۔ کراچی میں مرد و عورت کے اختلاط کی وجہ سے حالات خراب ہوئے جس کے نتیجے میں کشت و خون ہو رہا ہے۔ اس کو درست کرنے کے لیے جو حکومتی سطح پر تدبیریں ہو رہی ہیں، تدبیریں کرنا تو ان کے ذمہ ہے ہی، وہ تو کریں گے، لیکن اس کی بنیاد تو بے راہ روی ہے جو شہر میں چلی جس کے نتیجے میں کشت وخون ہو رہا ہے۔ اللہ پاک کے عذابوں میں سے ایک شکل یہ ہوتی ہے جو کہ سورہ بنی اسرائیل میں ذکر ہوئی کہ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ کہ ہم نے اپنے سخت گیر بندوں کو اُن پر مسلط کر دیا۔ اللہ پاک نے بخت نصر کی شکل میں اپنا عذاب ان پر مسلط کر دیا جس نے بنی اسرائیل کو اتنا مارا کہ خون کی ندیاں بہا کر چھوڑیں۔ یہ سب کیوں ہوا؟ کیونکہ ان کے اعمال خراب ہوئے اور اس کے نتیجے میں یہ عذاب آیا تو اس لیے میرے بھائی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

زندگی کی حقیقت

زندگی بہت ہی مختصر ہے۔ ہماری عمر میں آدمیوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ کھانا صحیح ہضم نہیں کر سکتا خاص طور سے مرغن اور روسٹ قسم کے کھانے۔ ایک امتحان کے دوران سرکاری کھانے آ رہے تھے تو میں نے کہا کہ اس سے مجھے معاف رکھو مگر انھوں نے بہت اصرار سے کہا کہ کھانا پڑے گا۔ اس کھانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ پورے پندرہ دن تک میں بیمار رہا۔ تو اس عمر میں آدمی کھانے کے ذائقے سے نکل جاتا ہے، سارے ذائقوں سے نکل جاتا ہے۔ پھر آخر میں تو اس قدر معذور ہو جاتا ہے کہ خود اس کا اپنا دل چاہتا ہے کہ یا اللہ! اب مجھے موت کا تحفہ عطا فرما دے تاکہ ان مصیبتوں سے میں بھی چھوٹ جاؤں اور میری وجہ سے میرے گرد و پیش کے لوگ بھی چھوٹ جائیں۔ زندگی بہت مختصر ہے، بہت ہی مختصر!

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی　ے
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

موت کا جھٹکا دھیرے دھیرے قریب آ رہا ہے

کیا تو نے ساری عمر زندہ رہنے کا بندوبست کیا ہوا ہے؟ کیا تجھے اس کی وحی ہوئی ہے کہ تیری عمر اب ختم نہیں ہونی ہے اور تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا۔ موت کا جھٹکا لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھ رہا ہے، قریب آ چکا ہے، (بقیہ صفحہ نمبر ۱۱ پر)

گھر کا سکون: ایک آرزو ہے سب کی قسط۔۲

(ایسوسیئیٹ پروفیسر ڈاکٹر فہیم شاہ صاحب، ڈیپارٹمنٹ آف میڈیسن، کوہاٹ میڈیکل کالج)

ہمارے گھر کی پانی کی مشین خراب ہوئی، میں نے ایک جاننے والے کو پیغام دیا کہ ہماری مشین ٹھیک کر دیں۔ چونکہ کافی عرصہ بعد ملاقات ہو رہی تھی اس لئے اس کے چہرے کے رنگ میں واضح تبدیلی دیکھ کر اندر کی بیماری کی تشخیص کرنا مشکل نہ ہوا۔ چہرہ زردی مائل، معمولی کام سے سانس کا اکھڑنا، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھانسی کا آنا۔ اس نے اپنا کام شروع کیا تو چہرے پر پسینے کے اثرات جلد ظاہر ہو گئے۔ میں نے دورانِ کام اس سے بیماری کے علاج کے متعلق پوچھا۔ اس نے جواب بڑی بددلی کے ساتھ دیا۔ جیسے اندر سے انسان مایوس ہو یا دل ٹوٹا ہوا ہو۔ اس کے کام میں بھی عدم دلچسپی ظاہر تھی۔ میں نے کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں تاکہ اندر کی بات پتہ چلے کہ علاج میں سستی کیوں ہے۔ حالانکہ میں نے اسے اس کی سینے کی ٹی بی کی بیماری کے متعلق بڑی وضاحت سے بات سمجھا دی تھی۔ اس نے بے رُخے پن سے بات اِدھر اُدھر کر دی۔ اسے رخصت کرنے کے بعد میں نے اس کے متعلق معلومات اکھٹی کیں کیونکہ مجھے غالب یقین تھا کہ یہ اس بیماری سے مر بھی سکتا ہے۔ ان معلومات کا نچوڑ یہ تھا کہ اس کی شادی اپنی چچازاد بہن سے ہوئی، دونوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ پردے کا اہتمام نہ ہونے کے برابر تھا۔ گھر میں رشتہ داروں کی آمد و رفت جاری رہتی۔ نماز اور دوسرے اعمال واجبی سے تھے۔ اس بندے کی کچھ سالیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ایک سالی کی شادی دوسرے شہر میں تھی۔ کبھی کبھار آنا جانا رہتا تھا۔ یہ فوج میں ملازم تھا۔ اس نے کوشش کر کے اپنے لئے ایک کواٹر کا بندوبست کر لیا اور اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کی بیوی یہاں سے شوہر کے ساتھ جانا چاہتی تھی یا نہیں اس بات کا علم اللہ ہی کو ہے۔ لیکن وہاں پہنچ کر معمول کے جھگڑوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس بندے نے بڑے شوق سے اپنے گھر کا سامان خریدا۔ اپنی بیوی کو محبت دینے کی پوری کوشش کی۔ لیکن بیوی نے محبت کا جواب بے رخے پن سے ہی دیا۔ اللہ نے اولاد کی نعمت سے نوازا۔ اس بندے کی ماں بچپن میں ہی وفات پا گئی تھی۔ والد صاحب نے دوسری شادی نہیں کی وہ بھی فوج سے ریٹائر تھے۔ کبھی کبھار ان کے ہاں چلے جاتے۔ حال حقیقت پوچھ کر واپس ہو جاتے۔ اچھے انسان تھے۔ اس بندے میں ماں کی محبت کی کمی بدرجہ اتم موجود تھی۔ بچے کو اپنے ماں باپ کی محبت صحیح نہ ملے تو ان کی زندگی میں ایک خلا رہ جاتا ہے۔ جسے وہ ساری زندگی محسوس کرتے رہتے ہیں۔ گھر والوں کے ساتھ زندگی چاہت کی ہو تو یہ خلا پر ہو جاتا ہے ورنہ احساس محرومی تاحیات چلتا رہتا ہے۔ اس کی ایک سالی اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گھر کچھ دن کے لئے آئی۔ ان کا دو یا تین دن کا قیام ہی ہو گا لیکن اس نے ان دنوں میں اپنی بیوی کے رویے میں کافی تبدیلی محسوس کی۔ مہمانوں نے جس دن واپس جانا تھا اس دن صبح یہ ان سے مل کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ ڈیوٹی سے تھکا ہارا واپس ہوا تو کھلا خالی گھر اس کا منہ چڑانے کے لئے کافی تھا۔ دروازے کھلے تھے۔ سارے گھر میں اس

نے بیوی کو آواز دی، بچے کو آواز دی لیکن آوازیں دیواروں سے ٹکرا کر واپس اس کے ہی کانوں میں زہر کا رس گھولنے لگیں۔ بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ دل کے زخم کو زخم سہنے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس نے معلومات کرائیں تو بیوی اپنی بہن کے ساتھ واپس اپنے گاؤں کے گھر پہنچ چکی تھی۔ اس کو اٹر کی قید سے آزاد ہو گئی لیکن شوہر کے دل کو ویران کر گئی۔ اس بندے کے دل کو صدمہ پہنچنا تھا ہی لیکن اس صدمے کی وجہ سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ بھرا گھر یونہی چھوڑ کر گھر سے نکل گیا۔ اپنی ملازمت سے بھگوڑہ ہو گیا۔ فوج کی ملازمت کو خیر آباد کہا اور واپس اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ بیوی سے وضاحت مانگی تو اس نے بے رخے پن سے جواب دیا کہ بہن گھر واپس آ رہی تھی ان کے ساتھ میں واپس آ گئی اس میں کیا حرج ہے۔ اس تُو تُو، میں میں نے اس بندے کو مزید دل برداشتہ کر دیا۔ انسان غلطی کر بھی جائے تو معافی سب سے عمدہ ہتھیار ہے۔ انسان پاؤں پکڑ کے معافی مانگ لے تو جتنی بھی بڑی غلطی ہوئی ہو معافی کے قابل بن جایا کرتی ہے۔ عموماً عورتوں کی عادت ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے شوہر یا دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتی ہیں۔ اپنے تئیں وہ ٹھیک کر رہی ہوتیں ہیں۔ حالانکہ کسی کا دل ٹوٹ رہا ہوتا ہے۔ اس کی خبر بھی نہیں ہوتی، نہ ہی کبھی خیال آتا ہے کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ عورتوں میں قوتِ بیانیہ اور قوتِ استدلال نہیں ہوتی۔ مرد کے ساتھ جب ان کی گفتگو ہوتی ہے وہ بیچارہ ان سے رنج ہی اٹھاتا ہے۔ وہ تو مناظرہ رشیدیہ کے قانون سے گفتگو کرتا ہے اور یہ الٹی سیدھی ہانکے چلی جاتی ہیں۔ مرد زبان زوری دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے مگر یہ کبھی خاموش نہیں ہوتیں۔ آخر یہ مناظرہ میں اس پر غالب آ جاتی ہیں۔ اگر محض بولنے، بک بک کرنے کا نام مناظرہ ہے تو گدھا بڑا مناظر ہے۔ عورتوں میں ایک کسر ہے کہ ان کی زبان نہایت خراب ہے ان کی زبان وہ اثر رکھتی ہے، جیسے بچھو کا ڈنک۔ ذرا سی حرکت میں آدمی بلبلا جاتا ہے۔ عورتوں کی بد زبانی بگاڑ کی جڑ ہے۔ (اصلاحِ خواتین ص ۱۴۶)

دوسری جگہ حضرت تھانویؒ نے ارشاد فرمایا کہ آج کل عورتوں کی حالت یہ ہے کہ یوں چاہتی ہیں کہ شوہر ہمارا غلام رہے۔ بس رات دن ہماری ہی عبادت کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا تو ارشاد یہ ہے کہ **و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون** (میں نے جنات اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) لیکن عورتوں کا مسلک یہ ہے کہ **و ما خلق الازواج الا لیطیعون** (شوہروں کو صرف اس لئے پیدا کیا گیا ہے تاکہ میری اطاعت کریں) شوہر کوئی بات نصیحت کی کہے تو ایک طعن (یا کوئی سخت کلمہ) بیچارے پر کس دیا اور اگر کچھ تیز ہوا تو فرماتی ہیں کہ میں کسی کی لونڈی یا باندی تو نہیں جو مجھے ایسا ایسا کہتے ہو۔ (اصلاحِ خواتین ص ۱۴۷)

الغرض بیوی کی بے وفائی کی وجہ سے اس بندے کی بول چال کم ہو گئی، لوگوں سے ملنا جلنا کم ہو گیا۔ صحت روز بروز بگڑنے لگی۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے کے مصداق ہنستا بستا گھر اجڑ گیا۔ اس دوران فوج کی طرف سے جن مشکلات کا سامنا اسے کرنا پڑا وہ ایک علیحدہ داستان ہے لیکن جسمانی مشکلات میں دل کے زخم نے سینے کے زخم کی شکل اختیار کر لی۔ کھانسی کبھی خشک اور کبھی بلغم کے ساتھ، بخار اور جسم میں درد، ٹھنڈے پسینے اور وزن کا کم ہونا، ٹی بی کی بیماری کی

علامتیں ہوتی ہیں۔اسے لوگوں نے مشورہ دیا کہ اپنا علاج کراؤ۔میرے پاس جب آیا تھا تو میں نے بھی اپنی طرف سے بہت سمجھایا لیکن دوائی کا استعمال صحیح طور پر نہ ہونے کی وجہ مریض کی عدم دلچسپی اپنی جگہ قائم رہی۔اسے دل کے صدمے نے بوجہ بیوی کی بے وفائی اپنی زندگی سے مایوس کر دیا۔ ہر وقت تکلیف میں رہنے والا آخر بستر مرگ پر گر گیا۔

بقول خواجہ مجذوب صاحبؒ:

خلاصہ ہم سے سن لے کوئی آداب محبت کا
دعائیں دل میں دینا، ظلم سہنا، بے زباں رہنا
بھلا یہ بھی کوئی انداز ہے اے بلبلِ نالاں
گلوں کے درمیان رہ کر بھی مشغولِ فغاں رہنا
یہی آتا ہے بس یا اور بھی کچھ تم کو آتا ہے
امیدیں توڑنا، دل خون کرنا، بدگمان رہنا

اس کا آخری وقت قریب آیا۔باہر دھوپ تیز تھی لیکن یہ اندر کمرے میں پڑے ہوئے پوچھ رہا تھا کہ باہر بادل آ گئے ہیں کیا کہ اندھیرا ہوتا جا رہا ہے۔کہنے والے نے ہاں میں ہاں ملائی۔چارپائی کے پاس لٹکے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنے ہاتھ اور پاؤں کو رگڑنے لگا۔سانس کی بے ترتیبی شروع ہو چکی تھی۔آنکھیں چھت کی طرف ٹک گئیں، زبان خاموش ہو گئی۔موت تمام تکالیف کا خاتمہ ہوتا ہے خواہ وہ جسمانی ہوں، ذہنی یا قلبی۔کچھ عرصہ بعد مجھے اس طرف جانے کا اتفاق ہوا۔کسی نے کہا کہ یہاں ایک بیمار ہے اس کو دیکھ لیں۔عید کا دن تھا۔لوگ اپنی اپنی خوشیوں میں مگن تھے۔میں اس گھر میں داخل ہوا تو رونے کی آوازیں کافی بلند سنائی دیں۔میں نے دیکھا اس آدمی کی بیوی اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کر رو رہی ہے۔مجھے آتا دیکھ کر خاموش ہوئی۔میں مریض کا معائنہ کر کے، دوائی لکھ کر واپس ہوا۔مجھے اس کی بیوی پر ترس بھی آیا اور غصّہ بھی۔ایک بے جا غیرت کی غلطی یعنی میں معافی نہیں مانگوں گی کتنے بڑے نقصان کا سبب بن جایا کرتی ہے۔دنیا فانی ہے ہر خوشی ختم ہو جایا کرتی ہے۔ ہر وقتی لذت ختم ہو جایا کرتی ہے۔میاں بیوی ایک دوسرے کا خیال رکھ کر محبت سے زندگی گزارنے والے ہوں تو گھر یوں نہیں اجڑا کرتے۔رشتہ داروں کو خوش کرنے کے لئے شوہر بیوی سے ناراض ہوتا ہے اور بے جا غصّہ کرتا ہے اور بیوی اپنے رشتہ داروں کی خاطر یا اپنے مشکل اور بے تکے مطالبات کی خاطر اپنے شوہر کو ناراض کر دیتی ہے اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے شوہر کا دل توڑتی رہتی ہے حالانکہ وقت تھوڑا ہوتا ہے۔دنیا فانی ہے۔ ہر خوشی اور غمی وقتی ہوتی ہے۔اگر تھوڑا اپنے نفس پر جبر کیا جائے تو گھر میں سکون کی فضاء قائم ہو جاتی ہے۔بقول خواجہ مجذوب صاحبؒ:

عیش دنیا ہیچ ہے دنیائے فانی ہیچ ہے
ہیچ ہے وہ چیز جو ہو آنی جانی ہیچ ہے
ذکرِ فانی بھی عبث ہے یہ کہانی ہیچ ہے

جس کا ہو انجام غم وہ شادمانی ہیچ ہے
عیش میں ہے بس وہی دنیا سے جو آزاد ہے

حضرت ابودرداؓ نے شادی کی پہلی رات اپنی بیوی سے فرمایا: ''ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے نئے لوگ ہیں لہٰذا جب تم مجھے غصہ میں دیکھنا تو مجھے خوش کرنے کی کوشش کرنا اور اگر کبھی میں تمھیں غصہ میں دیکھوں گا تو تمھیں خوش کرنے کی کوشش کروں گا، اور زیادہ شکوے شکایت نہ کرنا کہ اس سے محبت کم ہوتی ہے۔ اور یاد رکھنا کہ جس کی دل میں محبت ہو اور پھر اس سے اذیت پہنچے تو محبت دل سے رخصت ہو جایا کرتی ہے۔'' ان باتوں کو میاں بیوی نے پلے باندھ لیا۔ چنانچہ اتنی خوشی کی زندگی گزری کہ پھر ایک وقت آیا کہ جب ان کی بیوی نے ان سے کہا کہ دیکھیں ایک وقت تھا کہ میرے ماں باپ نے مجھے آپ کے نکاح میں دیا تھا اور آج شادی کے اتنے سال گزارنے کے بعد میں آپ سے اتنی خوش ہوں کہ میں اپنے آپ کو آخرت کے لئے بھی آپ کے نکاح میں دیتی ہوں۔ کیا مطلب؟ مطلب یہ تھا کہ میں آپ سے خوش ہوں کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ میاں بیوی جنت میں اگر جائیں گے تو عورت اپنے آخری خاوند کے ساتھ جنت میں جائے گی، تو اگر آپ کی وفات بھی ہو گئی تو میں آپ کے بعد دوسرا نکاح ہرگز نہیں کروں گی اور میں جنت میں بھی آپ ہی کی بیوی بننا چاہوں گی۔ (سکونِ خانہ ص ۴۷)

ایسی پرسکون زندگی اللہ تعالیٰ نصیب فرماتا ہے۔ جب زبان کا استعمال محبت بھرا ہو اور ایک دوسرے کا خیال رکھنا دل کی چاہت بن جائے۔ ہمیں اپنی قلبی بیماریوں کی طرف تو دھیان نہیں جاتا اور دوسروں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ شوہر بیوی پر نکتہ چینی کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور بیوی شوہر میں۔ ہر وقت کی نکتہ چینی اور اعتراضات دلوں کے فاصلے زیادہ کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

میں نے کئی گھروں کے حالات کا جائزہ لیا۔ جہاں جہاں یہ ناچاقی کے حالات تھے ان کی بے سکون زندگی کی وجوہات پر غور کرتا رہا تو ایک بنیادی نکتہ جو میری سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ طرفین (میاں بیوی) آپس کی محبت کا مفہوم جانتے نہیں ہیں۔ اصل مفہوم ایک دوسرے کے احساسات اور جذبات کو سامنے رکھ کر ایک دوسرے کو راحت پہنچانا ہے، فکر سے، قلب سے، زبان سے اور جسم سے۔ ان احساسات اور جذبات کو سمجھنے کے لئے انسان کا انسان بننا ضروری ہے۔ جہاں اس محبت میں کمی ہوگی وہاں لڑائیاں جھگڑے بھی زیادہ ہوں گے۔ میاں بیوی کا تعلق اگر دین میں ترقی کا سبب نہیں ہے تو یہ دنیا ہے۔ حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں: وہ چیزیں جو حظِ نفس (مزہ) کے لئے مخصوص لگتی ہے لیکن معناً اللہ کے لئے ہو سکتی ہیں جیسے غذا، نکاح اور وہ تمام امور جن سے ان کی اور اس کے اہل وعیال کی بقا وابسطہ ہے۔ اگر غذا اور نکاح سے واقعتاً حظِ نفس مقصود ہے تو یہ بھی دنیاوی عمل ہے اور اگر ان سے تقویٰ پر مدد حاصل کرنا ہے تو معناً اللہ کے لئے مخصوص ہیں۔ خواہ ان کا ظاہر انھیں دنیاوی عمل قرار دیتا ہو۔ (احیاء العلوم، جلد سوم، ص ۴۴۸)

ایک مقولہ ہے کہ مکان تو ہاتھوں سے بن جایا کرتے ہیں مگر گھر ہمیشہ دلوں سے بنا کرتے ہیں۔ اینٹیں جڑتی

ہیں تو مکان بن جاتے ہیں مگر جب دل جڑتے ہیں تو گھر آباد ہوجایا کرتے ہیں۔

معیت گرنہ ہو تیری تو گھبراؤں گلستان میں
رہے تو ساتھ تو صحرا میں گلشن کا مزہ پاؤں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (الاعراف ۱۸۹)

ترجمہ: وہ (اللہ ایسا قادر منعم) ہے جس نے تم کو تنِ واحد (آدم) سے پیدا کیا اور اسی سے اسکا جوڑا (حوّا) بنایا تاکہ وہ اس سے انس حاصل کرے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اپنے دلوں کو راحت اور سکون پہنچاؤ چاہے چند لمحوں کیلئے کیوں نہ ہو۔ دلوں سے زبردستی کام نہ لینا چاہئے۔ جب دلوں پر جبر کیا جاتا ہے تو وہ اندھے ہوجاتے ہیں۔ (احیاء العلوم جلد دوم ص ۵۵)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (روم ۲۱)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمھارے ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان سے آرام پاؤ، اس نے تمھارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کردی، یقیناً غور وفکر کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

مودّۃً سے مراد یہ ہے کہ مرد بیوی سے بے پناہ پیار کرتا ہے اور ایسے ہی بیوی شوہر ہے۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف فرما تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا "حمیرا! تم مجھے مکھن اور چھوہارے ملا کر کھانے سے زیادہ محبوب ہو۔" وہ مسکرا کر کہنے لگیں "اے اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے آپ مکھن اور شہد ملا کر کھانے سے زیادہ محبوب ہیں۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا "حمیرا تیرا جواب میرے جواب سے زیادہ بہتر ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خشیت الٰہی جتنی تھی اس کا اندازہ ہی ہم نہیں لگا سکتے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اہل خانہ سے موانست، پیار اور محبت کا بھی تعلق تھا۔ یہ چیز عین مطلوب ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس چیز کو پسند کرتے ہیں۔ (بکھرے موتی، جلد پنجم ص ۵۲۷)

ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ جب میاں بیوں ایک دوسرے کو محبت کی نگاہ سے دیکھ کر مسکراتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل پر خوش ہو کر مسکراتے ہیں۔

جب ہم ان باتوں کو جانتے ہیں تو عمل کیوں نہیں ہوتا۔ عمل پر آنے کے لئے انسان کے دل کا بننا ضروری ہے۔ نہ کبھی شوہر نے کوشش کی اور نہ بیوی صاحبہ نے کہ میں انسان کیسے بنوں۔ میں محبت کرنے والا شخص کیسے بنو۔ میاں

بیوی ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا تعلق صرف شکل وصورت کی بنیاد ہی پر نہیں ہوتا بلکہ صفات پر بھی ہوتا ہے۔ اپنے اندر جھانک کر اور کرید کرید کر قلبی بیماریوں کو صاف کر کے اخلاق حمیدہ سے متصف ہوں کر محبت کرنے والا انسان بننا کونسا مشکل ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ کبھی اپنے اندر جھانکا نہیں ہے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

تم میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب وہ لوگ ہیں جو محبت کرتے ہیں اور محبت کئے جاتے ہیں اور تم میں سے اللہ کے نزدیک مبغوض وہ لوگ ہیں جو چغلی کرتے ہیں، اور بھائیوں میں تفریق کا بیج بوتے ہیں۔

(طبرانی اوسط، طبرانی صغیر، ابو ہریرہؓ۔ احیاء العلوم جلد دوم ص ۲۵۳)

باطنی صفات کے نہ ہونے کی وجہ سے محبت کے جذبات اور احساسات انسان سمجھ نہیں سکتا۔ اسی سے دل کی بیماریوں کو مزید تقویت ملتی ہے۔ دل کدورتوں سے بھر جاتے ہیں۔ بیوی اور شوہر کا آپس میں ایک دوسرے کو ناقدری کی نگاہ سے دیکھنا، ایک دوسرے کے خلاف بدگمان ہونا، دوسروں کے سامنے میاں بیوی کا ایک دوسرے کے خلاف غیبت کرنا، لعن طعن کرنا، خودرائی، بدتمیزی، ناشکری، ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا وغیرہ جیسی مختلف مہلک بیماریاں دلوں میں پیدا ہو کر گھروں کو جہنم بنا دیتی ہیں۔ لوگوں کے سامنے تو اچھا گھرانہ ہوتا ہے لیکن اندر کا حال اللہ ہی جانتا ہے، جو کسی جہنم کے ٹکڑے سے کم نہیں ہوتا، نہ رات کو نیند نہ دن کو چین۔

ؔ زندگی بیت رہی ہے دانش
کوئی بے جرم سزا ہو جیسے

کیا ضروری ہے کہ ہم مختصر زندگی کو جھگڑوں کی نظر کر دیں۔ ہم یہ وقت محبت سے بھی تو گزار سکتے ہیں تاکہ دنیا کی راحت بھی پائیں اور آخرت کی بھی۔

ؔ زندگی یونہی بہت کم ہے محبت کے لئے
روٹھ کر وقت گنوانے کی ضرورت کیا ہے

ہمارے ایک جاننے والے کسی تقریب میں گئے۔ وہاں کا ماحول دین کے لحاظ سے کافی نقصان دہ تھا۔ چونکہ ہماری تقریبات ہمارے ذہنوں کا عکس ہوتی ہیں اور جس دین کو ہم لے کر چل رہے ہوتے ہیں وہی ہماری تقریبات میں ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ جیسے ہمارے حضرت صاحب نے ایک بیان میں فرمایا کہ حج کے دوران تمام مسلمانوں کے دین کی جھلک دکھائی جاتی ہے تاکہ ان کی دینی حیثیت اور حال کو دیکھ کر مشائخ اور علماء کرام ان کی اصلاح کی فکر کریں اور اپنے قلب میں اس دکھ کو محسوس کریں۔

اس بندے نے تقریب کے استقبالیہ پر جوان لڑکیوں کو کھلے بالوں کے ساتھ پایا تو دل میں ناگواری محسوس کی۔ اندر کا ماحول کچھ مختلف نہیں تھا۔ کچھ دیر کے لئے بھی وہاں پر اس سے نہ بیٹھا گیا اور اٹھ کر دل کے بوجھ کے ساتھ واپس گھر روانہ ہو گیا۔ وہ ایک دینی تحریک میں چلنے والا اچھا انسان تھا اس لئے اس بے دینی کے ماحول کو دیکھ کر کافی پریشان

ہوا۔اور پریشانی ہونی چاہیئے تھی۔ یہ اندر کی ایک صفت ہے ایمان کی۔اگر ہاتھ اور زبان سے بندہ نہ روک سکے، ایمان کے آخری درجے کے مطابق دل میں اس قسم کے ماحول کو برا سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔عموماً لوگوں کا حال اس کے بالکل برعکس ہے کہ نہایت بشاشت کے ساتھ ان مجلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔کوئی دینی غیرت پر عمل نہیں کرتا۔حالانکہ اس کے بارے میں بڑا واضح فتویٰ ہے کہ ایسی تقریبات جس میں ڈھول باجے ہوں شرکت حرام ہے۔بہر حال وہ بندہ دل کے بوجھ کو لئے گھر میں داخل ہوا۔گھر میں سلام کیا۔بیوی صاحبہ کو اپنے کام میں مصروف پایا۔کھانے پر جب اکھٹے بیٹھے تو اس بندے نے اپنا دکھڑا بیان کرنا شروع کیا۔چونکہ دل پہ بوجھ کافی تھا اس لئے ہر پریشان آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی کے سامنے اپنا غم بیان کرے۔لیکن ہر ایک کے سامنے بیان کرنا بھی نہیں ہوتا۔چونکہ بیوی دل کے قریب ہوتی ہے اس لئے اس سے دو مٹھاس کے جملے ایسی پریشانی کے وقت سن لے تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔بشرطیکہ وہ بھی اس بات کا ادراک رکھتی ہو اور دکھ سکھ کا ساتھی حقیقی معنوں میں ہو۔اس بندے نے حالات بیان ہی کرنا شروع کئے تھے کہ بیوی صاحبہ نے بات کاٹ کر فوراً تلخ لہجہ میں جملہ کس دیا کہ اس قسم کی تقریبات میں تم لوگوں کا جانا ہوتا ہی لڑکیوں کو دیکھنے کے لئے ہے۔بات کاٹنے کی بیماری الگ ہے، تہمت جیسی بیماری الگ، بات کی کاٹ اور تیزی الگ۔وہ بندہ کہتا ہے کہ میرے منہ میں نوالا تھا، چاہا کہ اس کو بھی باہر پھینک دوں اور اٹھ کر چلا جاؤں لیکن اپنے پر ضبط کر کے خاموشی سے بیٹھا رہا اور اپنے آپ کو ہی کوستا رہا کہ تجھے ضرورت ہی کیا تھی ایسی بات کہنے کی۔اب ایک کی بجائے دو باتوں کا بوجھ دل میں محسوس ہونے لگا۔ایک تو اس بے دینی کے ماحول کا دوسرا بیوی کی طعنہ و تشنیع کا۔ساری رات بے چینی میں گزری۔گھر کا ماحول باوجود وسعت کے مجھ پر تنگ ہو گیا۔تین دن تک میرا بیوی سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔بس سرسری بات چیت ہو جاتی۔ایک معمولی جملے نے ہماری زندگی کے تین دن سکھ کے چھین لئے۔بیوی صاحبہ کو پرواہ بھی نہیں تھی۔اپنے کاموں میں مشغول۔یہ کیسی دکھ سکھ کی ساتھی تھی جو شوہر کے چہرے کے تاثرات کو نہ پڑھ سکی۔یہ کیسا تعلق تھا کہ جو تین دن تک آپس کی بدگمانی کو نہ بچا سکا۔محبت کرنے والے کیا یوں ہوتے ہیں کہ بات بات پر بدگمان ہو کر ایک دوسرے کے کرب کا اضافہ کریں۔

یہ ہمارے گھروں کا حال ہے۔تقریباً ہر گھر ہی بے سکونی کی آگ میں تپ رہا ہے۔شکوہ شکایتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔بقول خواجہ مجذوب صاحبؒ

عبث کہتا ہے چارہ گر یہاں تک تھا یہاں تک ہے
وہ کیا جانے کہ زخمِ دل کہاں تک تھا کہاں تک ہے
کٹی روتے ہی اب تک عمر آگے دیکھئے کیا ہے
بتاؤں کیا کہ دل میں غم کہاں تک تھا کہاں تک ہے
مجھے تو عمر بھر رونا ہے یارو کوئی موسم ہو
یہ مت سمجھو مرا نالہ خزاں تک تھا خزاں تک ہے

ملفوظاتِ شیخ ﴿ڈاکٹر فدا محمد صاحب دامت برکاتہ﴾ (قسط۔۵۶)

(ظہور الٰہی فاروقی صاحب)

تبلیغِ دین اور فساد میں فرق:

فرمایا کہ تبلیغ دین کہتے ہیں اللہ کے تعلق اور معرفت اور توحید کو پھیلانا، حضور ﷺ کی محبت اور اتباعِ سنت کو پھیلانا، ہمدردی، اخلاص، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ان کے فضائل بیان کر کے ان کو پھیلانا، یہ تو تبلیغ ہے۔ اور امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنی چاہئے کہ نہیں پڑھنی چاہئے، اس پر جھگڑے کرنا، یہ میرے بھائی فساد ہے۔ ایک واقعہ آپ کو سناؤں کہ انگریزوں کی حکومت کے دور میں اتنا جھگڑا ہوا اہلِ حدیث اور حنفیوں کا کہ انہوں نے مقدمہ انگریز کی عدالت میں دائر کر دیا۔ آمین بالجہر، آمین بالسر، زور سے آمین کہنا اور آہستہ سے آمین کہنا، اس پر مقدمہ دائر ہوا تو دونوں نے دلائل دئے۔ آخر انگریز جج نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ کے پیغمبر ﷺ کی حدیثوں سے اور آپ کے قرآن پاک کی آیتوں سے میں یہ سمجھا ہوں کہ آمین بالسر، آہستہ کہنا بھی جائز ہے اور آمین بالجہر، زور سے کہنا بھی جائز ہے۔ دونوں کے بارے میں حدیثیں موجود ہیں اور مجھے اس ساری بحث سے ایک تیسری آمین کی قسم سمجھ آئی ہے اور وہ ہے آمین بالشر۔ آمین بالسر، آمین بالجہر اور آمین بالشر۔ تو یہ مقدمہ جو تم لے کر آئے ہو وہ آمین بالشر کا ہے۔ وہ انگریز اتنا سمجھدار تھا تو اس نے ان بے وقوف مسلمانوں کو سمجھایا کہ ایک بھی تمہارے پیغمبر کے ہاں جائز ہے، دوسرا بھی تمہارے پیغمبر کے ہاں جائز ہے۔ تم میں سے جو زور سے کہتا ہے وہ بھی جائز ہے، یہ نہیں کہ میں ٹھیک ہوں دوسرا غلط ہے، اور جو آہستہ کہتا ہے وہ بھی جائز ہے، اس کو بھی نہیں کہنا چاہیے کہ میں ٹھیک ہوں دوسرا غلط ہے۔ اس لئے ہم جو اہلِ سنت والجماعت ان چاروں اماموں والے کبھی یہ نہیں کہتے کہ شافعی، حنبلی جو زور سے آمین کہتے ہیں یہ غلط ہیں۔ جب بھی ہم نام لیتے ہیں تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے نیک بندے ہیں کیونکہ انہوں نے دلائل کی روشنی میں بات کی ہے لہٰذا کوئی ان کی تقلید کر کے، ان کی مان کر چل رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ اہلِ حدیث کی یہ کمزوری ہے کہ ہم ٹھیک ہیں تم غلط ہو، حالانکہ یہ فقہی اختلاف اور جزوی اختلاف ہے۔ جزوی اختلاف کی اجازت تو خود حضور ﷺ نے بھی اپنے سامنے صحابہ کرامؓ کو دی ہے۔

آج کل ہر ایک دانشور بنا ہوا ہے اور پشتو کے محاورے کے مطابق اپنی دُم کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا:

فرمایا کہ حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دہلی کے کسی کالج یا علی گڑھ یونیورسٹی کا کوئی پروفیسر آیا اور کہا حضرت صاحب میرے اسلام پر ایک سو بیس اعتراضات ہیں، آپ مجھے اُن کا جواب دیں۔ حضرت جیؒ نے فرمایا کہ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ چار مہینے لگا لیں۔ اُس نے کہا یہ میں نہیں کر سکتا۔ حضرت جیؒ نے فرمایا کہ آپ چالیس دن لگا لیں۔ اُس نے کہا میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ حضرت جیؒ نے فرمایا کہ پھر آپ چالیس شبِ جمعہ کو ہمارا بیان سننے کو آجایا کریں۔ اُس نے کہا ٹھیک ہے، یہ میں کرلوں گا۔ چالیس شبِ جمعہ مکمل ہونے کے بعد حضرت جیؒ نے اُس سے پوچھا کہ آپ کے سوالوں کا کیا ہوا؟ اُس نے کہا حضرت! سو کا جواب ہو گیا ہے اور باقی بیس کا جواب اب میں ضروری نہیں سمجھتا۔ حضرت جیؒ نے فرمایا کہ پہلے آپ دانشور اس لئے بنے ہوئے بیٹھے تھے کہ آپ نے کسی کو سنا نہیں تھا۔

ہمارے حضرت مولانا صاحبؒ کے پاس پی ایچ ڈی پروفیسر صاحبان آتے تھے تو آپؒ ایک مہینہ تک اُن کو ہی مجلس میں بولنے دیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ایک مہینہ میں، میں اُن کو خالی کرتا ہوں۔ خالی ہو کر جب وہ سننا شروع کرتے تھے تو اُن کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ میں تو کوڑا کرکٹ بول رہا تھا اور یہ آدمی تو علم و دانش بول رہا ہے اور میں نے اس کا بھی ایک مہینہ ضائع کیا ہے اور اپنا بھی۔

علامہ اقبال مرحوم نے جب 'Reconstruction of Religious Thought In Islam' لکھی تو اُس میں اُن کو مسئلہ اجتہاد کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مسئلہ اجتہاد میں بڑے بڑے دانشوروں سے خطا ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں ایک نکتہ ہے اور وہ نکتہ 'اجتہادِ مطلق' اور 'مطلق اجتہاد' کا ہے۔ جہاں تک اجتہادِ مطلق کا تعلق ہے وہ تو بنیادی اُصول ہیں جن کا صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے دور میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ مطلق اجتہاد نئے ظاہر ہونے والے مسئلے کو پہلے سے وضع کردہ اُصولوں (اجتہادِ مطلق) کے مطابق حل کرنے کو کہتے ہیں۔ اس لئے جس وقت کہا جاتا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے تو وہ اجتہادِ مطلق کے بارے میں کہا جاتا ہے اور جب کہتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے تو وہ مطلق اجتہاد کے بارے میں کہتے ہیں۔ یہی اچنبھا 'Reconstruction of Religious Thought In Islam' میں ہے۔

علامہ اقبال مرحوم کو کسی نے کہا کہ دیوبند کے ایک بہت بڑے عالم آئے ہوئے ہیں، آپ اُن سے جا کر مل لیں۔ یہ چلے گئے۔ دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے اور اُن کے آگے لوگ ایسے بیٹھے ہوئے ہیں گویا مچھلی

پانی میں اور نہ کوئی ذرا برابر حرکت ہو رہی ہے اور نہ کوئی بول رہا ہے، انتہائی سکون اور خاموشی ہے۔ اُن کا دَبدبہ اور رُعب مجلس پر چھایا ہوا ہے۔ اتنے میں کسی آدمی نے کوئی بات پوچھی۔ وہ صاحب جب بولنے لگے تو علامہ اقبال کو اندازہ ہوا کہ یہ آدمی تو وہ علم بول رہا ہے جس کی مجھے ضرورت تھی۔ یہ شخصیت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تھی۔ چنانچہ علامہ اقبال نے کہا کہ اجتہاد ایسی شخصیات کر سکتی ہیں، جب کہ میری طرح آدمی اُن سے سوال کر رہا ہو۔

'Reconstruction of Religious Thought In Islam' کی تحریر کے مطابق اب تک علامہ اقبال کا بیٹا جسٹس جاوید اقبال یہ بات کہتا رہتا ہے کہ اجتہاد پارلیمنٹ کو کرنا چاہیئے حالانکہ پارلیمنٹ والی بات کو علامہ اقبال نے علماء اور مشائخ سے ملاقاتیں کرنے کے بعد چھوڑ دیا تھا۔ علامہ اقبال ایسے حق پرست آدمی تھے کہ جہاں سے اُن کو حق بات ملتی تھی اُسے قبول کرتے تھے۔ اُن کی ایک پانچ سو اشعار کی کتاب 'مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق' شائع ہوئی تو اُس کے بعض اشعار کی حضرت سید سلیمان ندویؒ نے اصلاح کی۔ اس پر علامہ اقبال نے شکریے کا خط لکھا اور لکھا کہ آپ اس طرح کے مشوروں سے مجھے مستقبل میں بھی نوازتے رہیئے گا۔ اہلِ علم اور دانشوروں کے یہ طور طریقے ہوتے ہیں۔ جبکہ آج کل ہر ایک دانشور بنا ہوا ہے اور پشتو کے محاورے کے مطابق اپنی دُم کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے راز ھیں جس کو جس حال میں رکھا ھے وھی اس کیلئے بھتر ھے، اس کے گرد و پیش کے لوگوں کیلئے بھتر ھے:

فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سارے انسانوں کو اس دُنیا میں ایک آزمائش اور امتحان کیلئے بھیجا ہوا ہے۔ فرمایا تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿برکت والی ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے ملک، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے﴾ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ ﴿جس نے پیدا کی موت اور زندگی﴾ لِیَبْلُوَکُمْ ﴿تاکہ آزمائے تم کو﴾ اَیُّکُمْ ﴿کون تم میں سے﴾ اَحْسَنُ عَمَلاً ﴿اچھے عمل کرنے والا ہے﴾ اس زندگی میں جتنے حالات انسان پر آتے ہیں وہ سارے کے سارے آزمائش ہیں۔ آدمی پر تکلیف کا حال ہے تو آزمائش ہے، راحت کا حال ہے تو آزمائش ہے، مالداری کا حال ہے تو آزمائش ہے، غربت کا حال ہے تو آزمائش ہے، کسی کو اقتدار، حکومت دی ہے تو آزمائش ہے، کسی کو ماتحت بنایا ہے تو آزمائش ہے۔ ان تمام آزمائشوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس جگہ پر انسان کیسے استعمال ہو رہا ہے، کیسا عمل کر رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گزر رہے تھے، دیکھا کہ ایک تالاب میں بچے نہا رہے ہیں، بڑے خوش ہو رہے

ہیں، اچھل رہے ہیں، کُود رہے ہیں۔ ایک نابینا بچہ کنارے پر بیٹھا ہوا ہے۔ ان کو بڑا ترس آیا، بڑا دل دُکھا کہ اس بچے کی آنکھیں بھی ٹھیک ہوں تا کہ یہ بھی ان کے ساتھ نہائے دھوئے خوش ہو۔ تو انہوں نے اللہ کے حضور دُعا مانگی اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا، اس کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ سفر پر چلے گئے۔ اپنے سفر سے واپس آرہے تھے اس تالاب پر سے گزرے تو دیکھا کہ وہ بچہ جو تھا جس کی آنکھیں روشن ہوئی تھی اس نے اتنا سخت ہنگامہ کھڑا کیا ہوا ہے کہ سارے تالاب کے بچوں کو پریشان کیا ہوا ہے۔ تو انہوں نے دوبارہ دُعا مانگی کہ یا اللہ! یہ جیسے پہلے تھا ویسا ہی ہوجائے۔ جیسا تھا ویسا ہی ہوگیا، سب کو راحت ملی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے راز ہیں، جس کو جس حال میں رکھا ہے وہی اس کیلئے بہتر ہے، اس کے گردوپیش کے لوگوں کیلئے بہتر ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ان رازوں کو ہم اور آپ نہیں سمجھ سکتے اور نہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان رازوں کو کسی پر کھولنا چاہتا ہے نہ کسی کو بتانا چاہتا ہے۔

پلوسی کا مزدور:

فرمایا کہ یہ سردیوں کے دن تھے، سات بجے عشاء کی نمازیں ہوجاتی تھیں۔ نو بجے کے قریب گھر کی گھنٹی بجی۔ بندہ باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک پُرانا واقف کار پلوسی کا مزدُور کھڑا تھا۔ پلوسی پشاور یونیورسٹی کے پاس ایک گاؤں ہے۔ اس کا راستہ رات کو پُر امن نہ ہونے کی وجہ سے عموماً لوگ سردیوں میں نو بجے آمدورفت نہیں کرتے۔ مزدُور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ بندہ انتظار میں تھا کہ یہ اپنا مدعا بیان کرے، کوئی میرے لائق خدمت ہو کہے لیکن وہ بالکل نہیں بول رہا تھا۔ فوراً دل میں خیال آیا کہ اس کے بچے بھوکے ہوں گے۔ بندہ نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو تیس روپے نکلے۔ اُس نے جھٹ سے پیسے لئے اور فوراً سائیکل پر سوار ہو کر بھاگا۔ چند دن بعد ملا تو اُس نے کہا 'ڈاکٹر صاحب! اُس دن میں آپ سے پیسے لے کر بغیر کچھ کہے جھٹ سے نکلا اور بھاگا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے بچے بھوکے تھے، مجھے خطرہ تھا کہ کہیں تندور بند نہ ہوجائیں کیونکہ انہیں صرف سوکھی روٹی پہنچانی تھی۔' بندہ کو ایسے ہی خیال ہوا کہ جب اتنی تنگدستی ہے تو اس کی بیوی تو اس سے بہت لڑتی ہوگی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میری بیوی میرے ساتھ بالکل نہیں لڑتی البتہ تسلی دیتی رہتی ہے کہ یہ حالات اللہ پاک کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کبھی حالات بدل بھی دے گا۔ اس کی یہ بات سُن کر بندہ کو حیرت ہوئی کیونکہ ہمارے ہاں یونیورسٹی میں پروفیسر صاحبان کے گھروں میں ہر قسم کی سہولیات میسر ہوتی ہیں، کھانے پینے کی چیزوں سے فریج بھرے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی میاں بیوی کی ایسی لڑائیاں ہوتی ہیں کہ ایک دوسرے کے بال نوچتے ہیں۔ واقعی اس مزدُور کے گھر میں مادی وسائل نہیں تھے جبکہ معنوی وسائل بصورت اطمینان وسکون، باہمی تعاون اور باہمی

ہمدردی موجود تھے۔ جبکہ پروفیسر صاحبان کے ہاں مادی وسائل کی بہتات ہے لیکن معنوی وسائل بصورت اطمینان وسکون مفقود ہیں۔

جدھر مولا اُدھر دولہ:

فرمایا کہ ہمارے حضرت مولانا اشرف صاحبؒ کا بیان کردہ واقعہ ہے کہ گجرات میں ایک بزرگ دفن ہیں ان کو شاہ دولہؒ کہتے ہیں، بازار میں شیشوں والا چوک ہے اس میں دفن ہیں۔ شاہ دولہؒ براہ راست شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے خلیفہ ہیں، ان کے خلیفہ ماشوگگر (پشاور) میں ہیں شیخ حبیبؒ نام ہے غالباً، ان کے خلیفہ پھر شیخ جنیدؒ ہیں یہ محلّہ شیخ آباد میں ہیں، ان کے خلیفہ عمرزئی والے بزرگ ہیں، اُن کے خلیفہ تورڈھیر والے بزرگ ہیں، اُن کے خلیفہ سوات کے سیدو بابا صاحبؒ ہیں اور اُن کے خلیفہ پھر شاہ عبدالرحیم ولایتی صاحب، پھر شاہ عبدالرحیمؒ رائے پوری صاحب، پھر شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ ہیں جن کی خانقاہ رائے پور (ہندوستان) میں ہے۔ قادریہ سلسلے کا مرکز صوبہ سرحد رہا ہے، یہاں سے ہندوستان کو گیا ہے۔ سیلاب آ گیا لوگ شاہ دولہؒ کے پاس گئے کہ حضرت صاحب! گجرات پر سیلاب آ گیا، اس سیلاب کو روکیں۔ تو اُن کو ساتھ لے گئے۔ انہوں نے کہا کہ کدال لاؤ، کدال لائی گئی۔ سیلاب اُدھر آ رہا تھا، راستے میں اس کو جو مٹی روک رہی تھی، پانی کا راستہ دُرست کرنے کیلئے اس کو کھودنا شروع کر دیا تو سیلاب اور زیادہ ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت صاحب یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ تو انہوں نے کہا 'جدھر مولا اُدھر دولہ' جیسے اللہ کا فیصلہ ہے ہم بھی اُسی کے ساتھ ہیں۔ جب اللہ پاک کا فیصلہ سیلاب کا آیا ہوا ہے تو بس اب کیا کریں۔ اللہ کی شان کہ اُن کا یہ فرمانا تھا کہ سیلاب رُک گیا۔ مولوی صاحبان عربی کا جملہ بولا کرتے ہیں 'الخیر فی ما وقع' کہ جو واقعہ ہو گیا اسی میں خیر تھی۔

اللہ والے جو اسباب کو اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کے اَمر کے پورا کرنے کے اجر و ثواب کو حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں، اسی لئے وہ دُنیاداروں سے زیادہ اسباب اختیار کرنے کی کوشش کررہے ہوتے ہیں:

فرمایا کہ انسان اسباب اختیار کرنے کا مکلّف ہے یعنی اس کو اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے اللہ والے جو اسباب کو اختیار کرتے ہیں وہ اس اَمر کے پورا کرنے کے اجر و ثواب کو حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں، اسی لئے وہ دُنیاداروں سے زیادہ اسباب اختیار کرنے کی کوشش کررہے ہوتے ہیں۔ سبب کو ربّ سمجھ کر نہیں، سبب سے کام بنتا ہے اس لئے نہیں بلکہ سبب کے اَمر کو پورا کرنے پر جو اجر و ثواب ملتا ہے اس کو حاصل کرنے کیلئے۔ اسی لئے وہ معمولی سے معمولی اسباب کو اختیار کرتے ہیں۔ ہمارے حضرت مولانا صاحبؒ

مریض تھے، پیروں کی تکلیف کے سبب چل نہیں سکتے تھے، Muscular Dystrophy تھی یعنی پٹھے ختم ہوگئے تھے۔دَم کرنے والے لوگ ملنے کیلئے شوقیہ آتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ کی بیماری کا دَم کرنے کے لئے آئے ہیں۔کوئی بھی آتا تو آپ دَم کرالیتے تھے۔فرمایا کرتے تھے کہ میں اس حال میں بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں کہ مجھے شفا نہیں ہوگی، ابھی بھی مجھے پوری اُمید ہے کہ اللہ شفا دینا چاہے تو ہوجائے گی۔ وزیرستان سے کوئی سفید ریش گدی نشین تھے وہ دَم کیلئے آتے تھے، بڑی عمر کے آدمی تھے تو حضرت ان سے بھی دَم کراتے تھے کہ آدمی دَم کرنے کے لئے اتنے شوق سے آیا ہے تو چلیں دَم کردے۔ایک دفعہ اس طرح ہوا کہ وہ گدی نشین آگے بیٹھ گئے اور حضرت پیر لمبے کئے ہوئے بیٹھے تھے۔آپؒ نے کہا کہ میری ٹانگوں کو پیچھے کردو کہ جس آدمی سے میں دَم کرارہا ہوں اس کی بے ادبی نہ ہو۔حالانکہ خود قطبِ وقت تھے لیکن ایک عام دَم گر آدمی کی بے ادبی گوارہ نہ کی۔ایک دن میں گیا، دیکھا کہ ایک داڑھی منڈا آدمی دَم کررہا ہے۔میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ اس کا دوسرا بھائی ہے، کہتا ہے ہم گدی نشین ہیں ہم سب کو اجازت ہے۔جب فالج آخر میں ٹھیک ہونے کو ہو تو ان دنوں میں یہ آیا کرتا تھا، اس کے بھی نمبر ہوجاتے تھے۔ساتھیوں کو بڑا اعتراض ہورہا تھا کیونکہ ہم مولوی لوگ ظاہری شریعت کی بڑی پابندی کرتے ہیں۔میں نے کہا آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن حضرت صاحبؒ کو باطن میں ایسا حال حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس داڑھی منڈے سے بھی زیادہ گرا ہوا سمجھ رہے ہیں اور اس سے بھی دَم کرارہے ہیں۔فتوے وغیرہ آپ کو مبارک ہوں ہمارے تو دل کا یہ حال، کہ جس میں اپنا آپ ساری مخلوق سے گرا ہوا نظر آرہا ہو، یہی مبارک ہے۔سُبحان اللہ (جاری ہے)

(صفحہ آخر سے آگے) اسلامی جمیعت طلبہ کام کررہی ہے۔ہم اس لئے آئے کہ آپ ہماری تنظیم پر شفقت کی نظر رکھیں گے۔قاضی صاحب کی باتیں بہت شائستہ انداز میں تھیں۔اتنے بڑے لیڈر ہونے کے باوجود بہت تواضع والے تھے۔ان کا کمال ہے کہ انھوں نے باقی دینی تحریکوں سے جماعت اسلامی کی دوری کو کم کیا۔ایک دفعہ حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ اور ڈاکٹر خالد محمود صاحب سے کہا کہ میں جماعت اسلامی کے لٹریچر سے ان ساری باتوں کو نکال دوں گا جو جمہور علمائے اسلام کے مؤقف کے خلاف ہیں۔چنانچہ اس بات میں وہ کامیاب ہوئے۔ یہ ان کا امتِ مسلمہ پر بڑا احسان ہے۔عملی طور پر پوری ڈاڑھی رکھ کر اس بات کو رد کردیا کہ جماعتِ اسلامی کٹری ڈاڑھی کو جائز سمجھتی ہے۔ان کے اس عمل سے جماعت میں پوری ڈاڑھی کا رواج ہوا۔اللہ انھیں جنت کے بلند درجوں میں جگہ عطا فرمائے۔

تعزیت

(حضرت ڈاکٹر حاجی فدامحمد صاحب دامت برکاتہٗ)

حضرت مولانا زبیر الحسن صاحب دھلی
پروفیسر احمد گل صاحب
قاضی حسین احمد صاحب

کچھ عرصہ پہلے ہونے والی وفاتوں کی تعزیت بندہ کے ذمے قرض تھی۔ایک وفات حسرت آیات تو حضرت مولانا زبیر الحسن صاحب کاندھلوی کی ہے۔موصوف حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحبؒ، جو تبلیغی جماعت کے تیسرے امیر ہیں، کے صاحبزادے تھے۔مشائخِ کاندھلہ کا علم،فہم اور تقویٰ مثال رہاہے۔جناب حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی رحمتہ اللہ علیہ، جناب حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی رحمتہ اللہ علیہ اسی خاندان کے نامی گرامی اولیاء اللہ گزرے ہیں جن کی کرامتوں کا اپنے دور میں خوب چرچا ہوا۔اسی خاندان کے بزرگ مولانا اسماعیل صاحبؒ نے اپنی وسیع جائداد کو خیر باد کہہ کر بستی نظام الدین نئی دہلی کی بنگلے والی مسجد کو اپنا مرکز بنالیا۔اسی جگہ سے ان کے صاحب زادے جناب حضرت مولانا الیاس صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ذریعے تبلیغی جماعت کی عالمی تحریک چلی جس نے عالمی سطح پر حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں۔مشائخِ کاندھلہ میں حضرت مولانا زکریا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا نامِ گرامی بھی ہے جن کی فضائلِ اعمال کی کتابیں تبلیغی تحریک میں استعمال ہوکر لاکھوں لوگوں کی زندگیاں بدلنے کا ذریعہ بنیں۔ان کی 'موطاء امام مالک' کی شرح 'اوجز المسالک' عرب وعجم پر چھائی۔دوسری کتاب 'لامع الدُراری' تو پوری امتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ایک مثال ہے۔حضرت مولانا زبیر الحسن صاحب ایک طرف حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحبؒ کے صاحبزادے ہیں تو دوسری طرف قطب الاقطاب حضرت مولانا زکریا صاحب کے نواسے،اپنی خاندانی روایات کے مطابق ایک متبحر عالم، ذکر اذکار کی ترتیب اور تربیت سے گزرے ہوئے پختہ صوفی،فہم وفراست،تقویٰ اور معرفت کے نمونہ تھے۔

بندہ ۱۹۸۰ء میں اپنے شیخ ومربی حضرت مولانا محمد اشرف صاحبؒ سلیمانی کے ہمراہ دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات میں حاضر ہوا۔اس اجتماع کے بعد بستی نظام الدین میں حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحبؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔اس حاضری میں مولانا زبیر الحسن صاحب کی ملاقات بھی نصیب ہوئی۔حضرت جی نے زبیر صاحب کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی کہ کھانے کے وقت خود حضرت مولانا اشرف صاحبؒ کے

ہاتھ دھلایا کریں اور روٹی بجائے لنگر کے گھر سے لایا کریں۔ اس خدمت کے دوران دیکھا کہ زبیر صاحب بہت خوش مزاج اور تواضع کا پیکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی زندگی کے پورے وقت کو دین کے لئے وقف کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور جنت کے درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے۔

دوسری وفات جناب حاجی احمد گل صاحب کی تھی۔ موصوف ۱۹۶۰ء سے کالج کی تعلیم کے دوران تبلیغی تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے۔ پشاور مرکز کی شوریٰ کے رکن تھے۔ ان کے گھر کے پاس بندہ کے مرید امجد کے چچا حاجی یار محمد رہا کرتے تھے۔ حاجی یار محمد صاحب بھی تبلیغ کا کام کرتے ہوئے اپنے محلے کی مسجد میں باقاعدہ تعلیم بیان وغیرہ کرتے ہیں۔ یار محمد صاحب کا خیال ہوا کہ صبح کے وقت اگر 'تعلیم السلام' کی تعلیم شروع کردی جائے تو ساتھیوں کو مسائل کی واقفیت ہو جائے گی۔ حاجی احمد گل صاحب نے جب یہ منظر دیکھا تو یار محمد صاحب سے کتاب لے کر پھاڑ کر ان کے منہ پر دے ماری اور کہا کہ فضائلِ اعمال کی جگہ اس کی تعلیم کیوں کی؟ فراست کا یہ حال کہ کچھ وقت بعد احساس ہوا کہ اس طرز سے تو حاجی یار محمد ناراض ہو کر کام سے کٹ جائے گا اور تحریک کو نقصان ہوگا۔ فوراً ان سے مل کر معافی مانگی کہ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ اس پائے کی فکر اور فراست جس آدمی کو نصیب ہو وہ بھائی عبدالوہاب صاحب کی نگاہ میں جچتا تھا۔ چنانچہ بھائی عبدالوہاب صاحب نے احمد گل صاحب کو عالمی شوریٰ میں بھی شامل کیا۔ اس شوریٰ کا ایک رکن ہندوستان، ایک پاکستان اور ایک بنگلہ دیش سے ہوتا ہے۔ ہر رکن کو اپنے ساتھ دو معاون لینے کا کہا گیا۔ بھائی عبدالوہاب صاحب نے اپنا ایک معاون احمد گل صاحب کو رکھا۔ اچانک موت نے احمد گل صاحب کو ہم سے جدا کر دیا۔ اللہ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے۔

تیسری وفات جناب قاضی حسین احمد صاحب امیر جماعت اسلامی کی تھی۔ قاضی صاحب قصبہ زیارت کاکا صاحب نوشہرہ کے مشہور سلجوقی قاضی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان سے دیوبند کے نامی گرامی فاضلین ہوئے ہیں۔ حسین احمد صاحب کا تو نام ہی دیوبند کی مشہور شخصیت جناب حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بندہ کی پہلی ملاقات قاضی صاحب سے ۱۹۷۴ء میں ہوئی۔ قاضی صاحب اور اس وقت کے پشاور یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ کے صدر جناب ڈاکٹر ساعد صاحب بندہ سے ملنے کے لئے بندہ کے کلینک جابر فلیٹس میں آگئے۔ ڈاکٹر ساعد صاحب بعد میں جماعت اسلامی کی سیٹ پر سینیٹر بھی رہے۔ قاضی صاحب نے بندہ سے فرمایا: ''ڈاکٹر صاحب! تقویٰ حاصل کرنے کے لئے تو آپ لوگوں کی تحریک تبلیغی جماعت بہت مؤثر ہے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے اس سلسلے میں پشاور یونیورسٹی میں ہماری تنظیم (بقیہ صفحہ نمبر ۳۲ پر